الله جل جلالہ
خطباتِ فقیرؒ
جلد چوالیس
محبت والوں کا مانگنا
اختتامِ بخاری شریف
ذکر کے اثرات
سلوک کو طے کرنا
کامیابی کا راستہ
باکمال زندگی
دین کی محنت کا جذبہ
ایمان کی چار جہات
پیر طریقت، رہبر شریعت، مفکر اسلام
محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا
پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم
مکتبۃ الفقیر
MAKTABA-TUL-FAQEER
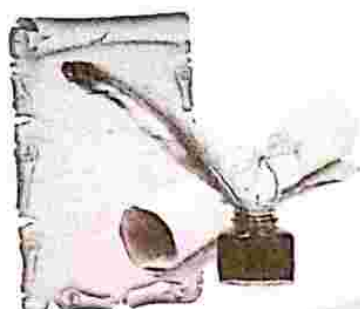
خطباتِ فقیر

44

محبوب العلماء والصلحاء

حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ

0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

فہرست مضامین

اختتامِ بخاری شریف

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے علوم ومعارف پر مبنی بیانات کو شائع کرنے کا یہ سلسلہ ’’خطباتِ فقیر‘‘ کے عنوان سے 1996ء بمطابق ۱۴۱۷ھ میں شروع کیا تھا اور اب یہ چوالیسویں (۴۴) جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح شاہین کی پرواز ہر آن بلند سے بلند تر اور فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے، کچھ یہی حال حضرت دامت برکاتہم کے بیاناتِ حکمت ومعرفت کا ہے۔ ان کے جس بیان کو بھی سنتے ہیں ایک نئی پروازِ فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ خطابت یا یاد کی ہوئی تقریریں نہیں ہیں بلکہ حضرت کے دل کا سوز اور روح کا گداز ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آپ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔

بقولِ شاعر: ؎

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

چونکہ یہ صاحبِ دل کی بات ہوتی ہے، اس لیے دلوں میں اثر کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت کے بیانات کو ایک قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ حضرت کے بیانات سے علماء بھی

محلہ بنا دیا۔ اِس ناتواں میں یہ ہمت کہاں؟...... مگر وہ جس سے چاہیں کام لے لیتے ہیں۔ بقول شخصے ع

"قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھوائے جاتے ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے شیخ کی دعا ہے اور اکابر کا فیض ہے جو کام کر رہا ہے،

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد جماعت کے کچھ دوستوں نے ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا، مکتبۃ الفقیر نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی، یوں "خطبات فقیر" کے عنوان سے نمبروار یہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ یہ عاجز کئی ایسی جگہوں پر بھی گیا جہاں یہ خطبات پہلے پہنچے ہوئے تھے اور وہاں علما وطلبا نے کافی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ان خطبات کے مطالعے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ بیانات کا مجموعہ ہے، ان میں علمی غلطی یا بھول کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اس لیے معزز علمائے کرام سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ دعا ہے کہ جو حضرات بھی ان بیانات کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیں اور انہیں اپنی رضا اپنی لقا اور اپنا مشاہدہ نصیب فرمائیں اور عاجز کو بھی مرتے دم تک اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

دعا گو و دعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

کان اللہ لہ عوضا عن کل شیء

عرضِ مرتب

یہ خطبات مجموعہ ہے باغِ علی رضی اللہ عنہ (حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ) کے ایک پھول، عشقِ صدیق رضی اللہ عنہ کو دل میں بسا کر مشربِ نقشبندیہ سے سیراب ہونے والی اور فنا فی الرسول کی منزل سے گزر کر فنا فی اللہ کا راز پانے والی ایک ہستی کے بیانات کا، جو نسبت کا نور دل میں لیے قریہ بہ قریہ قلوبِ انسانی کو محبت الٰہی سے گرمانے اور انہیں شریعت و سنت کی راہ پر لانے میں اپنے شب و روز ایک کیے ہوئے ہے۔ بلاشبہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ اس چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں اور کئی سرشار ہو رہے ہیں کہ

لطافتِ غمِ جاں سما گئی دل میں
نزاکتِ دلِ عاشق کو پالیا میں نے

حضرت اقدس محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے دعوتِ رشد و ہدایت کے سفر کی ابتدا خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ چکوال سے ہوتی ہے، جہاں انہیں مرشدِ عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت و خلافت کی نعمت سے شرف یاب فرمایا۔ عاجز کو حضرت اقدس مدظلہ سے بیعت ہونے کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب حضرت مرشد

عالم رحمۃ اللہ علیہ ابھی حیات تھے۔ حضرت کا بیان اس وقت بھی اتنا پر تاثیر ہوتا تھا کہ خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ چکوال کے سالانہ اجتماع میں مختلف شہروں سے آنے والے احباب کو حضرت کے بیان کا خاص طور پر انتظار رہتا تھا۔ بعدازاں حضرت دامت برکاتہم نے جھنگ میں دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا جو بہت جلد دوسرے شہروں میں پھیل گیا۔ چنانچہ فیصل آباد، لاہور، کراچی اسلام آباد گوجرانوالہ، بنوں وغیرہ میں مستقل بیانات ہونے لگے اور یہ سلسلہ روز بروز پھیلتا چلا گیا۔ ؎

راستے کھلتے گئے عزمِ سفر کے سامنے
منزلیں ہی منزلیں ہیں اب نظر کے سامنے

بیرون ملک سے دعوتیں ملنا شروع ہوئیں۔ امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں مستقل بیانات ہونے لگے۔ پھر روس کی آزاد ریاستوں کے دورے ہوئے۔ متعدد یورپی ممالک میں جانا ہوا، آسٹریلیا اور پھر افریقی ممالک کی باری آئی، جہاں اب بھی رمضان المبارک میں اعتکاف اور تربیتی اجتماعات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ برصغیر میں بنگلہ دیش، نیپال اور انڈیا میں جانا ہوا۔ انڈیا کے اسفار میں کثیر تعداد میں لوگ فیض یاب ہوئے، اور علما کی بڑی تعداد نے آپ سے روحانی استفادہ کے لیے رجوع کیا۔ مشرق بعید کے ممالک ملائشیا اور سنگاپور وغیرہ بھی جانا ہوا۔ مشرق وسطی میں عرب امارات، شام، اردن اور مصر جیسے ممالک اور پھر ترکی اور لیبیا میں بھی جانا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ حجازِ مقدس کی طرف حج وعمرے کے اسفار تواتر سے ہوتے رہے۔ ارضِ حرمین شریفین جہاں پر پورے عالمِ اسلام سے عشاق کھنچے چلے آتے ہیں، وہاں پر زائرین میں آپ کے بیانات کا ایک مستقل سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یوں اس مرکزِ فیض سے آپ کا فیض اطراف واکناف میں پھیل رہا ہے۔ سالانہ تربیتی نقشبندی اجتماع معہد

الفقیر الاسلامی جھنگ میں ہوتا ہے۔ جہاں پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے حضرت کے متوسلین کی کثیر تعداد جوق در جوق شریک ہوتی ہے۔ اس موقع پر حضرت کے خصوصی تربیتی بیانات ہوتے ہیں۔ جس کے حاضرین پر عجیب اثرات اور قابلِ دید کیفیات ہوتی ہیں۔ بقولِ شاعر

خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں رازِ حسن و عشق
اہلِ دل ، اہلِ جنوں ، اہلِ نظر کے سامنے

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ اقدس مدظلہ کو بیان کا ایک عجیب ملکہ عطا فرمایا ہے۔ حکمت کا گویا ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہوتا ہے، جس سے ہر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں محبتِ الٰہی، توبہ، انابت الی اللہ اور اصلاحی و تربیتی موضوعات پر بات ہوتی ہے۔ بقول

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں

عجیب بات تو یہ کہ ابتدا میں حضرت بیانات کی ریکارڈنگ سے سختی سے منع فرما دیتے تھے کہ تشہیر کو ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن کس کس کو کب تک روکتے اہلِ شوق اتنے تھے کہ آخر ریکارڈنگ ہونا شروع ہوگئی اور لاتعداد کیسٹیں بننے لگیں۔ آڈیو سی ڈیز کا دور آیا تو سی ڈیز والیم بھی بننے لگے۔ تاہم جو مقبولیت ''خطباتِ فقیر'' کی کتاب کو ملی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عوام الناس سے زیادہ یہ خطبات علمائے کرام میں مقبول ہو رہے ہیں کیونکہ انہیں ان میں سے علم و حکمت پر مبنی پر تاثیر مواد میسر آ جاتا ہے۔ اس طرح وہ بالواسطہ طور پر حضرت کے فیض کو آگے پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس قدر کام میرے حضرت سے لے رہے ہیں اور جس قدر عوام و خواص کا رجوع ان کی طرف ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر جہاں خوشی ہے وہاں یہ فکر بھی لاحق

ہو رہی ہے کہ کہیں یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا ناقوس تو نہیں بج رہا۔ہائے افسوس کہ ہم کس قدر وقت ضائع کرنے والے ہیں......!!! اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت کی زندگی کی قدر کرنے کی اور ان سے خوب خوب استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرما دیں۔آمین ثم آمین

مجھے بے فکر کر دے گردشِ ایام سے پہلے
پلا نظروں سے بھی کچھ بادۂ گلفام سے پہلے

دعاؤں کا طالب
خاکپائے اولیاء
فقیر شاہد محمود نقشبندی
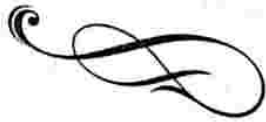
محبت والوں کا مانگنا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة:١٦٥)

وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

((مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَائَهُ وَ مَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَائَهُ)) [جامع ترمذی، حدیث:١٠٦٧]

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

انسان کا فطری جذبہ:

ہر انسان کے اندر فطری طور پر آئیڈیل کی تلاش رکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ بچہ پیدا

ہوتا ہے، پھر جب بڑا ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک چاہت ہوتی ہے کہ میں کچھ بنوں، میں کچھ حاصل کروں۔ یہ ایک فطری پیاس ہے، ایک فطری بھوک ہے جو اللہ نے ہر انسان کے اندر رکھ دی ہے۔ چنانچہ اس کا جی چاہتا ہے کہ میں کچھ بنوں۔ یہ جذبہ ہر انسان کے اندر کیوں ہے؟ اس کے بارے میں دنیا کے مفکرین نے مختلف آراء قائم کیں۔

ایڈلر کا نظریہ:

ایڈلر نے کہا: حصولِ طاقت کی خواہش انسان کے اندر ہوتی ہے، لہٰذا وہ چاہتا ہے: میں پڑھوں، میں مال دار بنوں اور اصل انجام وہ کیا چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں پاور ہو۔ یہ فطری طور پر انسان کے اندر ایک چیز رکھ دی گئی ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ:

ایک اور مغربی مفکر فرائیڈ تھا۔ اس نے کہا: انسان کے کچھ بننے کا جو جذبہ ہے، اس کے اندر اصلاً جنسی خواہش ہے۔ فطری طور پر وہ مال، عہدہ، سب کچھ اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اپنی مَن پسند کی عورت حاصل کر سکے، اس کے ساتھ اپنی مَن پسند کا وقت گزار سکے، اپنی جنسی خواہش کو اپنی مرضی کے مطابق پورا کر سکے۔

مارکس کا نظریہ:

ایک اور مفکر تھا، اس کا نام تھا مارکس۔ اس نے کہا: نہیں بھئی! کچھ بننے کی خواہش اصل میں ایک معاشی خواہش ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میں مَن پسند کا کھاؤں۔ ہماری زبان میں کہتے ہیں: ''پیٹ نہ پیّاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں'' کہ جب پیٹ میں روٹیاں نہیں پڑتیں تو سب باتیں کھوٹی ہوتی ہیں۔ کسی نے بھوکے سے پوچھا تھا: دو اور دو کتنے ہوئے؟ اس نے کہا: چار روٹیاں، بھوک جو لگی ہوئی تھی۔

لیکن یہ جتنی باتیں مغربی مفکرین نے کہیں یہ سب باتیں غلط ہیں۔ کیونکہ جن کو طاقت نصیب ہوتی ہے، وہ بھی بے چین...... جو اپنی جنسی خواہش مَن مرضی سے پوری کر لیتے ہیں، وہ بھی بے چین...... جن کے پیٹ ہر وقت بھرے رہتے ہیں، وہ بھی بے چین...... اس کا مطلب ہے کہ اصل چیز ان کے علاوہ کوئی اور ہے۔

فطری جذبہ خدا طلبی کا جذبہ ہے:

دینِ اسلام نے اس کی نشاندہی کی اور کہا کہ ہر انسان کے اندر خدا طلبی کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ وہ اپنے پروردگار کو، کائنات کے پیدا کرنے والے کو، جس نے اسے نعمتوں سے نوازا اس کو پانا چاہتا ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ ''خدا طلبی'' یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہدایت مل گئی تو وہ ایک خدا پر ایمان لے آیا، ہدایت نہ ملی تو اس نے ہندوؤں کی طرح ہر چیز کو خدا بنالیا۔ سانپ کو خدا بنالیا، آگ کو خدا بنالیا، نہ جانے کس کس چیز کو خدا بنالیا؟ لیکن خدا کو پانے کا جذبہ ہر انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔

اللہ کی محبت ہر مومن میں موجود ہے:

بالخصوص جن لوگوں نے کلمہ پڑھا، وہ تو سارے کے سارے اللہ کے چاہنے والے ہیں۔ کلمہ پڑھ لینا اس بات کی دلیل ہے کہ اب اس بندے کے اندر اللہ کی محبت موجود ہے۔

ہاں! محبت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ جیسے گرم پانی کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اگر کسی کو گرمی میں عام نل کا پانی پینے کو دیں تو وہ اس پانی کو بھی کہے گا کہ یہ کیا گرم پانی لائے ہو، فرج کا پانی لاتے۔ وضو کے لیے جب پانی آتا ہے تو اس کو بھی گرم پانی کہتے ہیں۔ نہانے کا جو پانی آتا ہے، اس کو بھی گرم پانی کہتے ہیں۔ اور چائے کے کھولتے پانی کو بھی

گرم کہتے ہیں۔ ہیں سب گرم پانی، مگر کسی کا ٹمپریچر کم ہے اور کسی کا ٹمپریچر زیادہ۔ بالکل اسی طرح محبت ہر مومن میں ہے، کسی میں محبت کا یہ درجہ حرارت کم ہے اور کسی میں زیادہ۔ اولیاء اللہ کے اندر یہ درجہ حرارت ابلتے پانی کی طرح ہوتا ہے۔ ابلتے پانی کی طرح والے درجے کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں یوں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔''

یعنی ایمان والے اللہ سے ٹوٹ کے پیار کرتے ہیں۔ ان کی محبتوں کی انتہا اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ اسی لیے جتنے بھی کلمہ گو ہوں، ان کو محبت کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اگرچہ نماز میں سستی کر رہا ہے، غفلت کر رہا ہے، لیکن وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ اس نے اللہ کو مانا تو ہے، اس کے اندر استعداد تو ہے، اس کو ماحول مل گیا تو وہ اچھا بن جائے گا۔ ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلف کے سب اسیر ہوئے

سب اللہ کے چاہنے والے ہیں۔ ؎

نہ دانماں گلِ خنداں چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغِ ہر چمنِ گفتگوئے او دارد

''میں نہیں جانتا کہ وہ ہنستے پھول ہی کا رنگ اور اس کی خوشبو کیا ہے؟ باغ کا ہر پرندہ اسی کا تذکرہ، اسی کی گفتگو کرتا ہے۔''

سب سے زیادہ چاہی جانے والی ذات:

واقعی! اس کائنات میں جتنا اللہ رب العزت کو چاہا گیا، جتنا اللہ سے ٹوٹ کر پیار کیا گیا، جتنا اللہ کے نام پر اپنی جانوں کو فدا کیا گیا، جتنا تنہائیوں میں اللہ رب العزت کو یاد کیا

گیا، جتنا تنہائیوں میں اللہ کے سامنے آنسو بہائے گئے، کائنات میں اللہ کے سوا کوئی دوسری ایسی ہستی نہیں۔ یہ شان صرف اللہ رب العزت کی ہے کہ اس سے اس طرح ٹوٹ کر پیار کیا گیا۔ شیخ حسن واعظ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے چند عجیب اشعار ہیں، فرماتے ہیں: ؎

افسانہ خویش مختصر کن
بنشیں در درونِ خود سفر کن

''دوست کا افسانہ مختصر ہے کہ بیٹھ جا اور اپنے اندر سفر کر ادھر ادھر باہر بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے اندر سفر کریں۔''

ہر وہم و خیال و فہم و ادراک
در دل کہ جز اوست آں بدر کن

''ہر وہم، خیال، فہم اور احساس، دل میں اللہ کے سوا جو بھی ہے بس اس کو دل سے نکال دیں۔''

مطلوب بس است در دو عالم
از دل تو گزر آں حضر کن

''اس دو جہاں میں بس یہی مطلوب ہے کہ تیرے دل میں اللہ کا ڈیرہ ہو۔''

ایں است وصال جانِ جاناں
ذی راہ بہر کسے خبر کن

''ہر کسی کو یہ راز کی بات بتا دے کہ اصل میں یہی محبوب کا وصال ہے۔''

چنانچہ کہنے والے ایک کامل نے کہا: ؎

از نعمتِ ایں جہاں ثنائے تو بس است
از نعمتِ آں جہاں لقائے تو بس است

''اے اللہ! اس جہاں کی سب سے بڑی نعمت تیری تعریف، تیری یاد ہے اور اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت تیری ملاقات ہے۔''

اللہ اکبر کبیرا! انسان کی جب دل کی آنکھ کھلتی ہے، تب اس کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ؎

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق ہو اگر شریکِ بینائی
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
تیرا وجود ہے قلب و نظر کی رُسوائی

نگاہِ شوق یعنی محبت کی نظر ہونی چاہیے، جو اپنے محبوب کو تلاش کرے، جو محبوب کے لیے بے قرار ہو۔

مخلوق کی محبت اور اللہ کی محبت کے تین فرق

مخلوق کی محبت میں...... مخلوق سے مراد یہاں ما سویٰ کی نفسانی اور شہوانی محبتیں ہیں۔ اس کو ہمارے مشائخ کی اصطلاح میں ''مخلوق کی محبت'' کہہ دیا جاتا ہے۔ باقی جو دین کی نسبت سے محبتیں ہیں وہ تو اللہ کی محبت میں شامل کر دی جاتی ہیں...... اور اللہ رب العزت کی محبت میں تین عجیب فرق ہیں:

پہلا فرق:

پہلا فرق یہ ہے کہ جو انسان مخلوق سے ڈرے، وہ مخلوق سے دور بھاگے۔ ہم سانپ سے ڈرتے ہیں تو اس سے دور بھاگتے ہیں، کسی بندے کا خوف دل میں ہو تو اس سے دور بھاگتے ہیں۔ یعنی مخلوق کا معاملہ یہ ہے کہ جتنا کوئی شخص مخلوق سے ڈرے اتنا وہ

اس سے دور بھاگے۔ لیکن اللہ کا معاملہ دیکھو کہ جتنا کوئی شخص اللہ سے ڈرے، اتنا اللہ کے قریب ہو جائے۔ اللہ اکبر کبیرا!

دوسرا فرق:

اب دوسرا فرق سمجھیے۔ مخلوق کی محبت میں محب یہ چاہتا ہے کہ محبوب کا جسم ہمارے پاس ہو، اس کا دل چاہے جہاں مرضی ہو۔ اس کو محبوب کے دل سے غرض نہیں ہوتی، جسم پر نظر ہوتی ہے، جسم مطلوب ہوتا ہے۔ مخلوق کی محبت میں طمع ہوتی ہے کہ جسم ہمارے پاس ہو اور دل اس کا چاہے جہاں کہیں بھی ہو۔ مگر اللہ رب العزت کی محبت کا معاملہ عجیب ہے! اللہ رب العزت چاہتے ہیں: میرے بندے! تیرا دل میرے پاس ہونا چاہیے، جسم تیرا جہاں مرضی ہو۔ تو مسجد میں ہو، تب بھی میں تجھ سے راضی، تو بازار میں ہو، تب بھی میں تجھ سے راضی، بس تیرا دل میرے پاس ہو۔

تیسرا فرق:

پھر مخلوق اور خالق کی محبت میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ جس نے مخلوق سے محبت کی ایک نہ ایک دن مخلوق سے جدا کر دیا جائے گا اور جو شخص اللہ سے محبت کرے گا، ایک نہ ایک دن اللہ سے ملا دیا جائے گا۔ اس لیے اللہ رب العزت کی محبت ہی ہمیں اپنے دل میں پیدا کرنی چاہیے، اسی کو اپنا محبوبِ حقیقی بنانا چاہیے۔ مرنے والوں سے اور ڈھلنے والوں سے کیا محبت کرنا؟ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائیدار
عشق را باحی و باقیوم دار

''مرنے والوں سے عشق پائیدار نہیں ہوتا، عشق کرنا ہے تو حَیٌّ قَیُّوْم سے کرنا

چاہیے۔‘‘

اللہ کی یاد لازم ہے:

اس لیے اللہ رب العزت نے اپنی یاد کو بندے پر لازم فرما دیا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا:

﴿وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ [الاعراف:۲۰۵]

’’اور ان لوگوں میں شامل نہ ہو جانا جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: ہر وقت مجھے یاد کرو۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ رب العزت کی اس محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

مُخْبِت بنیں گے تو جنت ملے گی:

قرآنِ مجید میں ایک آیت مبارکہ ہے، توجہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (ھود:۲۳)

’’جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کے آگے جھک کر مطمئن ہو گئے ہیں تو وہ جنت کے بسنے والے ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔‘‘

اب یہاں پر تین باتوں کا تذکرہ ہے۔ ایمان لانے والے، نیک اعمال کرنے والے اور عاجزی کرنے والے۔ بس یہیں کام ہو جاتا کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر جنت ملے گی، مگر اللہ تعالیٰ نے درمیان میں ایک چیز اور بھی رکھ دی۔ کیا فرمایا؟ ﴿وَ

﴿اَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّھِمْ﴾ یہ ''اخبات'' کیا ہے؟ عاجزی اختیار کرنا، فروتنی اختیار کرنا، اپنی مَیں کو مٹانا، اللہ کے سامنے عبدِ کامل بن جانا۔ اس کو اخبات کہتے ہیں۔ یہ باب افعال میں سے ہے۔ اَخْبَتَ یُخْبِتُ اِخْبَاتًا فَھُوَ مُخْبِتٌ تو ہم اعمال کے ساتھ ساتھ مُخْبِتْ بھی بنیں گے تب جنت میں جائیں گے۔ اب آپ کے یہاں آنے کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اس اِخْبَات کو حاصل کرنا ہے۔ دل کی وہ کیفیت بن جائے کہ دل اللہ کے ساتھ جڑ جائے، نتھی ہو جائے۔

دین کی بنیاد اللہ کی محبت ہے:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((اَلْحُبُّ اَسَاسِیْ)) ''محبت میری بنیاد ہے۔''

[الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ: ۱/۱۴۶، احیاء علوم الدین لمحمد الغزالی: ۴/۳۶۱]

پورے دین کی بنیاد اللہ کی محبت ہے، اور جس کو یہ نعمت نصیب ہوگئی، اس کے لیے دین پر عمل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ جب کسی سے محبت ہو اور وہ کوئی کام ذمے لگا دے تو بندہ اسے کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے، اسے تھکاوٹ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جس بندے کو اللہ رب العزت سے محبت ہوتی ہے، وہ دوڑتا پھرتا ہے، وہ دین کا کام کرنے کے لیے بھاگتا پھرتا ہے۔ ایسا بندہ پھر نماز کو حاکمِ وقت کی بیگار سمجھ کر نہیں پڑھتا، بلکہ وسیلۂ لقائے یار سمجھ کر پڑھتا ہے۔ آج ہم نماز تو پڑھتے ہیں لیکن حالت یہی ہوتی ہے جیسے مجبور ہیں، کیا کریں۔

کسی دیہاتی کو مولانا صاحب نے زبردستی کہا کہ پڑھو نماز! اس نے نیت باندھی: نیت نماز کی، بندگی اللہ تعالیٰ کی، درود نبی علیہ السلام کا، ظلم مولوی صاحب کا، اللہ اکبر۔ آج

ہماری نمازوں کا بھی یہی حال ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مجبوری میں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔نہیں بھئی! جب دل میں محبت ہوتی ہے تو مجبوری کی بات نہیں ہوتی۔ پھر تو انسان انتظار کر رہا ہوتا ہے، فجر پڑھتا ہے تو ظہر کا انتظار......ظہر پڑھی تو عصر کا انتظار...... نماز اس کو Refresh (تروتازہ) کر دیتی ہے۔اسی لیے تو نبی علیہ السلام فرماتے تھے:

((يَا بِلَالُ أَقِمِ الصَّلَاةَ أَرِحْنَا بِهَا)) [سنن ابی داؤد، حدیث:۴۹۸۷]

''اے بلال! نماز قائم کر کے اس سے ہمیں راحت دو۔''

بلال اذان دیتے تھے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں میں ٹھنڈک آتی تھی، نماز ایسی چیز ہے۔

حج، دنیا میں جذبۂ محبت کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے:

اللہ رب العزت نے محبت کے اس جذبے کو پورا کرنے کے لیے دنیا میں اپنا گھر بنا دیا اور فرمایا: میرے بندو! تم اگر محبت کا یہ جذبہ پورا کرنا چاہتے ہو تو پھر رمضان گزارو اور رمضان گزارنے کے بعد تم میری ملاقات کے لیے میرے گھر کو آؤ۔ اسی لیے جیسے ہی رمضان ختم ہوا، شوال سے احرام باندھنے کا وقت شروع ہو گیا۔ تو رمضان اصل میں ایسا ہی ہے جیسے بچے کو کسی کے سامنے پیش کرنا ہو تو ماں اس کو نہلاتی دھلاتی ہے، اس کی میل دور کر کے اچھے کپڑے پہنا کر تیار کر دیتی ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو اپنے پاس ملنے کے لیے بلانا تھا تو رمضان کا مہینہ عطا کر دیا کہ میرے بندو! باطنی طور پر غسل کر لو۔

......اپنے گناہوں کو معاف کروالو

......اپنے دلوں کو دھلوالو

......اپنے دلوں کی سختی کو دور کروالو

......میری محبت کی پوشاک پہن لو

اور پھراس پوشاک کو پہن کر جیسے ہی رمضان ختم ہوگا، تم میرے گھر کی طرف چل پڑو۔ اب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ادھر رمضان ختم ہوتا اور اگلے دن حج ہوتا۔ مگر یوں ساری دنیا کے لوگوں کے لیے تو پہنچنا مشکل تھا، وہ پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے درمیان کے جو ایک دو مہینے ہیں، وہ سفر کے لیے دے دیے کہ جب میرے پاس آئیں گے تو کوئی اونٹنیوں پر چڑھ کر آئے گا، کوئی جہازوں اور کشتیوں کے ذریعے آئے گا۔

فرمایا: میرے ابراہیم!

﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴿۲۷﴾﴾ (الحج:۲۷)

''اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں، اور دور دراز کے راستوں سے سفر کرنے والی ان اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں جو (لمبے سفر سے) دبلی ہوگئی ہوں۔''

تو یہ حج کے موقع پر عشاق کا مجمع ہوتا ہے، اللہ اکبر کبیرا۔ بہرحال اس کی تفصیل اس موقع پر تو نہیں بیان ہوسکتی۔ مگر ہمارے بزرگوں نے کہا: رمضان کام کا مہینہ ہے، ذوالحجہ انعام کا مہینہ ہے۔ جو رمضان المبارک میں خوب عبادت کرے گا، جب ذوالحجہ میں اللہ کے دَر پر جائے گا تو انعام ملے گا۔ تو حج بھی محبت کا جذبہ پورا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

عشق کی بازی جیتنے کے لیے سب کچھ ہارنا پڑتا ہے:

جو لوگ حج کر کے آتے ہیں، ان کا شوق پہلے کی نسبت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ ایک بار دیکھا ہے، بار بار دیکھنے کی طلب ہے۔ کسی نے کیا اچھی بات کہی!

دل وجان کی وہ دولت جو پیاری رہی اب تک
ترے کوچے میں پھر پھر کر وہیں پہ اس کو وار آئے
وہ عالم کیف و مستی کا، وہ طوفاں اشک باراں کا
الٰہی زندگی میں پھر وہ آئے، بار بار آئے
مطاعِ عقل و دانش جمع کی تھی عمر بھر میں جو
وہ میقاتِ حرم پر عشق کی بازی میں ہار آئے

عشق کی بازی جیتنی ہوتو سب کچھ ہارنا پڑتا ہے۔عجیب بات ہے کہ یہاں جیت اس کی ہوتی ہے جوسب کچھ ہار دیتا ہے۔ واہ میرے مولا! تیری محبت کا بھی معاملہ عجیب!!!

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے گر ہار گئے تو مات نہیں

یہ بھی اللہ رب العزت کی محبت کی بازی ہے۔

گر جیتنا ہو عشق میں لازم یہ شرط ہے
کھیلو اگر یہ بازی تو سب کچھ ہی ہار دو

اللہ اکبر کبیرا!

عشق کے لیے ہجرت کرنا پڑتی ہے:

انسان اللہ رب العزت کا وصل حاصل کرنے کے لیے پوری ہمت صرف کرے۔ اللہ رب العزت قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں:

﴿فَفِرُّوٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ (الذاریات:۵۰)

''لہٰذا دوڑو اللہ کی طرف۔''

جیسے جانور بندھا ہوا ہو، اس کو چھوڑیں تو وہ بھاگتا ہے، بالکل یہی بات ہے۔تم مخلوق کے تعلقات میں جکڑے ہوئے ہو،تم نفس کی زنجیروں میں پکڑے گئے ہو، اپنے آپ کو چھڑا کر اللہ کی طرف بھاگو، اللہ کی طرف دوڑو، تیزی کے ساتھ سفر کرو، اللہ سے وصل کے لیے۔عشق کے لیے ہر انسان کو ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ہجرت کا کیا مطلب؟ ہجرت کا مطلب نبی علیہ السلام نے سمجھایا۔فرمایا:

((اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَ الذُّنُوْبَ)) [صحیح ابن حبان، حدیث:۴۸۶۲]

''اصل مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو ترک کر دے۔''

جو ہجرت کر جاتا ہے، وہ مہاجر ہے۔ہمیں بھی اللہ کے راستے میں مہاجر بننا پڑے گا۔

﴿اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ (العنکبوت:۲۶)

دیکھا! قرآن نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف مہاجر ہوں، جا رہا ہوں، سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے راستے میں۔ چنانچہ ہر انسان کو ہجرت کرنی ضروری ہے۔

......جہالت سے ہجرت، علم کی طرف

......غفلت سے ہجرت، ذکر کی طرف

......معصیت سے ہجرت، طاعت کی طرف، اور

......مخلوق سے ہجرت، خالق کی طرف

ہر بندے کو کہیں نہ کہیں یہ ہجرت کا معاملہ پیش آئے گا، تب وہ آگے بڑھے گا۔

ذکر سے تبتّل کی کیفیت ملتی ہے:

اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کھول کر یہ بات کر دی۔ فرمایا:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝﴾ (المزمل:۸)

''اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو، اور سب سے الگ ہوکر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو۔''

تبتل کہتے ہیں: ''انقطاع عن المخلوق'' کو۔ کیا مطلب؟ کیا مخلوق سے واسطہ نہ رکھے؟ نہیں نہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے توڑو! اللہ سے جوڑو! پھر اللہ کی نسبت سے مخلوق سے جوڑو۔ اپنا تعلق رکھنا چاہتے ہو تو اللہ کی نسبت سے رکھو، نفس کی خواہشات کے پیچھے نہ رکھو، اس کو تبتل کہتے ہیں۔ ہم نے اللہ کے ذکر کو اس نکتے پہنچانا ہے کہ ہمیں تبتل کی وہ کیفیت نصیب ہو جائے۔

اللہ کی محبت ازل سے انسان کی فطرت میں موجود ہے:

جب انسان اللہ کے ذکر کی کثرت کرتا ہے تو پھر اللہ رب العزت کی محبت اس کے دل میں ٹھاٹھیں مارتی ہے، کیونکہ ذکر سے انسان کو ذات سے محبت نصیب ہوتی ہے۔ کسی نے کیا اچھی بات کہی!

ساقی وہ کون سا تھا جس نے یہ مے پلا دی
صبحِ ازل کو پی تھی اب تک سرور کیوں ہے؟

یہ محبت کی شراب ہم نے کب پی تھی؟ یومِ الست کو پی تھی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ رب العزت نے سب انسانوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ

اور کَلَّمَهُمْ قِبَلًا ان سے کلام بھی فرمایا اور ان پر تجلی بھی فرمائی۔ اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرما کر اپنی مخلوق کو کیفِ علم عطا کر دیا اور اپنی تجلی دِکھا کر مخلوق کو سوزِ عشق عطا فرما دیا۔ یہ نعمتیں اس وقت سے دے دیں۔ اس لیے روحیں شروع سے اللہ کو تلاش کرتی ہیں۔ فطری طور پر انسان اللہ کا متلاشی ہے، کیونکہ وعدہ کر کے آیا ہوا ہے۔

تو اس کے بارے میں کسی نے کہا:

ساقی وہ کون سا تھا جس نے یہ مے پلا دی
صبح ازل کو پی تھی اب تک سرور کیوں ہے؟
حبلُ الورید سے بھی نزدیک تر، پھر ترسنا
اے پاس رہنے والے! آنکھوں سے دور کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، تو اس کا تذکرہ کیا کہ جب اتنے پاس رہنے والے ہیں کہ رگِ جاں سے زیادہ قریب ہیں تو دل تو پھر چاہتا ہے کہ دیکھیں۔ اسی لیے تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہہ دیا تھا:

﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾ [الاعراف:۱۴۳]

''میرے پروردگار! مجھے دیدار کرا دیجیے کہ میں آپ کو دیکھ لوں۔''

چنانچہ مومن کا جی چاہتا ہے کہ اللہ رب العزت کا دیدار کرے۔ اب اس دنیا کے اندر اتنی Capacity (استعداد) نہیں، اتنی Capability (صلاحیت) نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ان تجلیات کو سنبھال سکے۔ اس لیے اس ملاقات گاہ کا نام اللہ تعالیٰ نے جنت رکھا۔ وہاں مومن جائے گا اور اپنے رب کی دید کے مزے پائے گا۔ اس کا نام جنت ہے۔ وعدہ فرما دیا کہ جب تم آؤ گے تو وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ہم تمہیں اپنا دیدار بھی کروائیں گے۔ اللہ اکبر کبیرا۔

شیطانی محبت کا نزلہ، محبت الٰہی کی خوشبو سے محروم کر دیتا ہے:

اس دنیا میں انسان اپنا دل اگر مخلوق میں سے کسی کے ساتھ لگا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک آدمی کو نزلے زکام کی بیماری ہو جائے تو اس کو خوشبو کا پتا نہیں چلتا۔ اس کو کہیں کہ جی! یہ عنبر خوشبو ہے، یہ مشک ہے، اسے پتا ہی نہیں چلتا۔ وجہ کیا؟ نزلہ زکام سے ناک ہی بند ہے بیچارے کی۔ بالکل اسی طرح جس بندے کو مخلوق کی نفسانی، شیطانی، حیوانی محبتوں کا نزلہ ہو جاتا ہے، اللہ رب العزت کی محبت کی خوشبو کا اسے پتا ہی نہیں چلتا۔ اس لیے لازم ہے کہ پہلے دل سے ان محبتوں کو ختم کیا جائے، تب دل اللہ رب العزت کی محبت کے مزے کو پہچانتا ہے۔ ایک روایت میں ہے:

ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''كُلُّ مَا شَغَلَكَ عَنِ اللهِ مِنْ أَهْلٍ وَّمَالٍ وَوَلَدٍ فَهُوَ عَلَيْكَ مَشْئُوْمٌ''

[احیاء علوم الدین: ۳/۱۰۱]

''جو چیز بھی تجھے اللہ سے باز رکھے خواہ وہ مال ہو، بیوی ہو یا اولاد ہو، منحوس ہے۔''

وہی تمہارا صنم ہے۔

اللہ بندے کی نیک تمناؤں کو پورا کر کے خوش ہوتے ہیں:

انسان اس دنیا میں اگر دل کے اندر نیک تمنائیں رکھے اور اس کے لیے پھر کوششیں بھی کرے تو اللہ رب العزت بندے کی تمناؤں کو پورا کر کے خوش ہوتے ہیں۔ آپ نے ماں باپ کو دیکھا ہے کہ اولاد کی محبت ان کے دل میں ہوتی ہے، لہٰذا وہ

بچے کی چھوٹی چھوٹی تمناؤں کو پورا کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مالدار باپ ہو، اور اس کے دل کے اندر اللہ نے رحم بھرا ہوا ہو تو وہ چھوٹے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کر کے خوش ہوتا ہے۔ اگر باپ کے اندر یہ جو شفقت رکھی گئی ہے، اس کا تقاضا یہ کہ خواہشات کو پورا کر کے خوش ہوتا ہے تو اللہ رب العزت تو اللہ رب العزت ہیں، وہ بھی اپنے بندوں کی تمناؤں کو پورا کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اللہ اکبر! چاہے کیسی ہی تمنا کیوں نہ ہو۔

ایک صحابی تھے حضرت خزیمہ ﷛۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نبی ﷺ کی پیشانی کے کنارے پر سجدہ کر رہے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک روح، روح سے مل جاتی ہے، نبی علیہ السلام نے اپنا سر جھکایا اور انہوں نے پیچھے سے آپ کی پیشانی پر سجدہ کیا۔

[مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۳۱۱۵۵]

وہ مالک کتنا کریم ہے! کتنا مہربان ہے!

؎ راہ برسوں کی طے ہوئی پل میں
عشق کا ہے بہت بڑا احسان

یہ عشق و محبت سے برسوں کی راہ پل کے اندر طے ہو جاتی ہے۔

مخلوق کی محبت کے دعویٰ داروں سے ڈرنا چاہیے:

محبت صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ مخلوق کی محبت انسان کے لیے بہت بڑا فتنہ ہوتی ہے۔ اسی لیے مخلوق کی محبت کا کوئی دعویٰ دار ہو تو ڈرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر: عورت محبت کے دعویٰ داروں سے اس طرح ڈرے جیسے کوئی ہرن شیر سے ڈرتا ہے۔ اس لیے کہ محبت کے دعوے ہوئے اور فتنہ شروع ہوا۔ آپ ذرا غور کیجیے! حضرت یوسف علیہ السلام

سے زلیخا نے محبت کی، حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچ گئے۔ اللہ اکبر کبیرا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے محبت کا دعویٰ فرمایا تو یوسف علیہ السلام کنویں میں پہنچ گئے۔ اس لیے اس سے ڈرنا چاہیے اور اس سے بچنا چاہیے کہ یہ مجھے کنویں میں پہنچائے گا یا جیل میں پہنچائے گا۔ ایک اللہ رب العزت کی محبت ایسی ہے کہ سبحان اللہ! انسان ٹوٹ کر اللہ رب العزت سے پیار کرے۔ اگر انسان یہ محبت کرے تو اللہ رب العزت اسے ضرور منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

اللہ کے محب کو مقصود ضرور ملے گا:

ہمارے مشائخ نے کہا: جو شخص اللہ رب العزت سے محبت کرے گا، اوّل تو اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ اس کو وہ نعمت عطا فرما دیں گے اور اگر اس کی موت بھی آ گئی تو اس کی روحانی ترقی اس کی قبر میں جاری رہے گی، اللہ قیامت کے دن منزل پر پہنچنے والوں کے ساتھ حشر فرما دیں گے۔ ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) نیت میں سچا تھا۔ جیسے روایات میں آتا ہے کہ کوئی بندہ حفظ کرنے کی نیت کر لے، اگر اس کو موت بھی آ جائے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حفاظ کے ساتھ کھڑا کریں گے۔ تو محبت کی نیت کر لیجیے اور کہیے: اے اللہ! بس آپ کی محبت چاہتے ہیں، آپ کی محبت والی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، پھر دیکھیے! اللہ رب العزت کی رحمت کیسے برستی ہے!

عاشق کے نور سے جہنم کی آگ ڈرتی ہے:

یہ محبت الٰہی عجیب چیز ہے۔ عام بندہ موت سے ڈرتا ہے، اور محبت الٰہی سے موت ڈرتی ہے۔ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عام بندے کو آگ جلاتی ہے، جہنم کی آگ عام بندے کو جلائے گی، لیکن جب اللہ کے عاشق پل صراط سے گزرنے لگیں

گے تو جہنم کہے گی:

''جُزْ یَا مؤمِنُ'' ''اے مومن! (پل صراط) سے گزر''

''فَقَدْ أَطْفَأَ نُورُكَ لَهَبِي'' [الجامع الصغیر، حدیث:۳۳۵۴]

''کیونکہ تیرے نور (ایمان) نے میری بھڑک کو بجھا دیا ہے۔''

مومن کے دل کا نور ایسا ہوتا ہے۔ اللہ اکبر۔

انسان درد محبت کی وجہ سے ممتاز ہے:

اسی لیے انسان کو اللہ رب العزت نے تمام موجودات کے مقابلے میں جو بزرگی عطا فرمائی، جو اشرف المخلوقات فرمایا، وہ اسی درد محبت کی وجہ سے فرمایا، باقی مخلوقات یہ درد محبت نہیں رکھتیں۔ یہ درد اللہ نے فقط انسان کو عطا فرمایا۔ اس لیے یہ درد محبت دل میں جتنا زیادہ ہوگا، اتنا اللہ رب العزت کے ہاں قرب زیادہ ہوگا۔ اب یہ ذہن میں رکھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں کچھ نہ دینا چاہتے تو طلب کا مادہ ہی نہ دیتے۔ جب طلب کا مادہ دے دیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دینا چاہتے ہیں۔ اب لینا ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم طلب ظاہر کریں۔ کوئی بچہ جب تک روئے نہ، ماں بھی دودھ نہیں پلاتی۔ اگر ہم بھی اللہ کے سامنے کچھ روئیں دھوئیں گے، مانگیں گے، کچھ سجدے کریں گے، تنہائیوں میں بیٹھ کر اللہ رب العزت کو منائیں گے تو اللہ رب العزت بھی یہ نعمت عطا فرمائیں گے۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ہمیں۔

اللہ کی ایک عاشقہ کا حال:

ہمارے اکابر بھی اللہ کی محبت میں زندگی کے دن اور راتیں گزارتے تھے، سبحان

اللہ! حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں ایک باندی لے کر آیا جو بہت سستی بک رہی تھی اور بڑی کمزور اور پیلی سی تھی۔ وہ گھر میں آئی تو سارا دن میری خدمت کرتی، جب رات کا وقت آتا تو مجھ سے پوچھتی: جی! آپ کو کوئی کام، کوئی میری ضرورت؟ میں کہتا: نہیں۔ وہ وضو کر کے مصلّے پر کھڑی ہو جاتی، ساری رات مصلّے پر گزارتی۔ میں کچھ دن اس کا طریقہ کار دیکھتا رہا، ایک دن میں نے اس کو کہا: میرا بستر بچھا دو۔ جب میں نے کہا: میرا بستر بچھا دو، تو وہ پوچھنے لگی: آپ کا بھی کوئی مولا ہے؟ میں نے کہا: ہاں! میرا بھی مولا ہے۔ اس نے کہا: کیا وہ مولا سوتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا کہ بڑی حیرت کی بات ہے: تمہارا مولا جاگتا رہے اور تم پاؤں پھیلا کر سوتے رہو۔ کہنے لگے: اس نے عجیب بات کی، میرے دل کو چوٹ لگائی، اب مجھے سمجھ میں آئی کہ یہ سارا دن میری خدمت کرتی ہے اور ساری رات اپنے رب کی عبادت کرتی ہے۔ کہنے لگے: وہ پھر مصلّے پر چلی گئی اور رات کو عبادت کرتی رہی، لیکن میرے دل میں بھی ایک تڑپ آ گئی، لہٰذا مجھے اس رات پوری طرح نیند نہیں آئی۔ میں نے جب آنکھ کھولی، ذرا توجہ کی، دیکھا کہ وہ دعا مانگ رہی تھی: اے اللہ! آپ کو مجھ سے محبت رکھنے کی قسم! جب اس نے یہ بات کی تو میں نے اونچی آواز سے کہا: اے لڑکی! کیا دعا مانگ رہی ہے ہو؟ یوں کہو: اللہ! مجھے آپ سے محبت رکھنے کی قسم، یوں کیوں کہہ رہی ہو کہ آپ کو مجھ سے محبت رکھنے کی قسم؟ کہنے لگے: جب میں نے یہ بات کی تو وہ غصے میں آ گئی، کہنے لگی: اگر اللہ رب العزت کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو تمہیں میٹھی نیند نہ سلاتا اور مجھے ساری رات مصلّے پر نہ جگاتا۔ مجھ سے محبت ہے تو مصلّے پر جگایا ہے نا مجھے۔ پھر اس کے بعد اس نے شعر پڑھے:

اَلْکَرْبُ مُجْتَمِعٌ وَ الْقَلْبُ مُحْتَرِقٌ
وَ الصَّبْرُ مُفْتَرِقٌ وَ الدَّمْعُ مُسْتَبِقٌ

''بے چینی جمع ہو رہی ہے اور دل جل رہا ہے۔ اور صبر جدا ہو گیا ہے اور آنسو بہہ رہے ہیں۔''

یہ اللہ کی محبت ایسی ہے کہ بندے کو بے قرار کر دیتی ہے۔ اللہ اکبر!

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: عاشق صادق کی زندگی ایسے گزرتی ہے، جیسے اللہ نے قرآنِ مجید میں فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ﴾

''یہاں تک کہ جب ان پر یہ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی، ان کی زندگیاں ان پر دوبھر ہو گئیں۔''

اور ایک ایسی کیفیت آئی کہ

﴿وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ﴾ (التوبۃ:۱۱۸)

''اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے خود اسی کی پناہ میں آئے بغیر کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی۔''

سالک کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا میرا اور کوئی ملجا اور ماویٰ نہیں۔ یہی کیفیت اس نوجوان لڑکی کی تھی۔ کہتی ہے:

كَيْفَ الْقَرَارُ عَلٰى مَنْ لَا قَرَارَ لَهٗ
مِمَّا جَنَاهُ الْهَوٰى وَ الشَّوْقُ وَ الْقَلَقُ
يَا رَبِّ اِنْ كَانَ شَيْئٌ فِيْهِ لِيْ فَرَجٌ
فَامْنُنْ عَلَيَّ بِهٖ مَا دَامَ بِيْ رَمَقُ

’’اس کو کس طرح قرار آ سکتا ہے جس کو عشق و شوق اور بے چینی کے حملوں کی وجہ سے ذرا بھی سکون نہیں۔ اے اللہ! اگر کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس میں غم سے نجات ہو تو زندگی میں اس کو عطا فرما کر مجھ پر احسان فرما۔‘‘

یہ اشعار پڑھنے کے بعد اس نے کہا: اے اللہ! میری اور آپ کی محبت کا معاملہ اب تک چھپا ہوا تھا، اب لوگوں کو پتا چل گیا، مولا! اب مجھے اپنے پاس بلا لے۔ بس اتنی بات کہی، کلمہ پڑھا اور اپنی جان اپنے جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ اکبر کبیرا! جب دل زندہ ہوتا ہے تو پھر انسان کو اللہ رب العزت کی محبت کی لذت محسوس ہوتی ہے۔

پتھر دل اور صاحبِ دل کا فرق:

دیکھیں! آپ پتھر پر پانی ڈالیں تو پتھر بھیگ تو جائے گا لیکن پتھر کو اس کے ذائقے کا پتا نہیں چلے گا کہ یہ پانی تھا یا شربت؟ اور زبان پر آپ ایک قطرہ ڈالیں، زبان بھیگے گی بھی، مگر ساتھ مزا بھی پائے گی۔ فرق کیا تھا؟ یہ زندہ ہے اور وہ مردہ ہے۔ یہی دل کا حال ہے کہ پتھر دل انسان عبادت کرتا ہے، اس پر بھی وہی تجلیات اور وہی انوارات پڑتے ہیں، مگر اس کو ذائقے کا پتا نہیں چلتا اور جو صاحبِ دل ہوتا ہے اس کو پتا چل رہا ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی محبت کی نظر اب میرے اوپر کیسی ہے؟ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ رب العزت کی محبت اللہ سے مانگیں اور اس محبت کے ساتھ اعمال کریں تو اللہ کے ہاں بہت جلدی قبول ہو جائیں گے۔ اللہ رب العزت بڑے کریم ہیں، بڑے ہی مہربان ہیں۔

فرعون اور منصور کی ’’انا‘‘ کا فرق:

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا: جی! فرعون نے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى، انا کا

نعرہ لگایا اور اس کو دریا میں ڈبو دیا گیا، انجام بُرا ہوا۔ اور منصور حلاج نے بھی کہا: اَنَا الْحَقُّ، انا کا نعرہ لگایا، مگر منصور کو عزتیں ملیں۔ اُدھر ذلت ملی، اِدھر عزت ملی، فرق کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ فرق یہ ہے کہ فرعون نے اللہ کو پیچھے کیا، اپنے آپ کو آگے کر کے کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اور منصور نے اپنے آپ کو مٹایا اور اللہ کی محبت میں ڈوب کر ''انا'' کہا کہ میں بھی نہیں ہوں، جو ہے میرا رب ہے۔ اس لیے اللہ نے ان کو عزتیں عطا فرما دیں، محبت عجیب چیز ہے! اللہ اکبر کبیرا

اللہ تعالیٰ کی نرمی کا معاملہ:

اب ذرا اللہ تعالیٰ کے کرم کا معاملہ دیکھیں: قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرعون کا تذکرہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو اللہ نے فرعون کی طرف بھیجا اور ان دونوں پیغمبروں کو فرمایا کہ جاؤ فرعون کے سامنے دعوت پیش کرو۔ مگر ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ ''اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا۔'' لین کہتے ہیں نرمی کو، نرمی کا معاملہ کرنا۔ اب ذرا سوچیے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہنے والا جو بندہ ہے، پروردگار اس کی طرف انبیاء کو بھیج رہے ہیں اور ان کو بھی نصیحت اور ہدایت فرماتے ہیں کہ نرمی کا معاملہ کرنا۔ اب وہ بندہ جو اللہ کی توحید کا قائل ہو اور پھر سجدے میں سر ڈال کر سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہے، اب یہ بندہ اگر اللہ سے مانگے گا تو اللہ اس کے ساتھ کتنی نرمی والا معاملہ فرمائیں گے۔ وہ بڑے کریم ہیں، وہ بڑے مہربان ہیں، بس مانگنے کی بات ہے، اللہ کرے کہ ہمیں مانگنا آ جائے۔

ہے کشش پر مدار ہستی کا
عشق جانِ جہاں ہے گویا
جب سے دل میں ہوا گزر تیرا

یہ مکاں لا مکاں ہے گویا
عشق کی راہ و رسم الٹی ہے
یہاں خاموشی زبان ہے گویا

محبت اور غم انسان کو مانگنا سکھا دیتے ہیں:

محبت ہو یا غم ہو، یہ بندے کو گفتگو کا طریقہ سکھا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر: بیٹا بیمار رہے تو ماں کو دعا مانگنے کا سلیقہ خود بخود آ جائے گا کہ کیسے تڑپ کر مانگنا ہے، اس کو سکھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بچہ بیمار ہے تو بچے کی محبت ماں کو سکھا دے گی کہ مانگنا کیسے ہے؟ آنسو گر رہے ہوں گے، ایسے ایسے الفاظ ماں استعمال کرے گی کہ سن کر حیران ہوں گے کہ ماں کو یہ مانگنا کس نے سکھایا؟ محبت نے سکھایا۔ تو محبت اور غم انسان کو مانگنا سکھا دیتے ہیں۔ اللہ اکبر کبیرا! پھر بندہ مانگتا ہے۔

ایک بڑے میاں کی پُرخلوص دعا:

ایک دفعہ ایک بڑے میاں کی دعا ہم نے سنی، اللہ اکبر! رمضان کی ایک مبارک رات تھی، ایک محلے کی مسجد میں لوگ جمع تھے، لائٹیں بند تھیں اور ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ بھئی! سارے محلے والے جاگ رہے ہیں تو ہم کیوں سوئیں؟ میرے ساتھ ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دعا مانگ رہے ہیں، پنجابی زبان میں دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں: ''اللہ میاں! ہِک واری جنت وچ وڑن دیویں، اگاں آپے لگا وتساں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ایک مرتبہ جنت میں داخل ہونے دینا، آگے میں خود ہی پھرتا رہوں گا۔'' اللہ اکبر کبیرا

بڑا مزا آیا اس دعا کو سن کر، اس میں خلوص تھا، اتنی بے ساختگی میں اس نے بات

کی تھی، اللہ میاں! ایک مرتبہ جنت میں داخل ہونے دینا آگے پھرتا رہوں گا۔ تو بات ایسی ہی ہے کہ واقعی مانگنا آجاتا ہے، محبت میں یا غم میں بوڑھوں کی باتیں بڑی مزے کی ہوتی ہیں۔

ایک اُداس بوڑھے کی دعا:

ایک اور بات سنا دیتا ہوں، ایک بوڑھا تھا۔ اس بیچارے کی بیوی فوت ہوگئی۔ اب اسے اکیلا پن محسوس ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ نماز پڑھ کر دعا مانگنے لگا:

''اللہ! کلاّ تاں توں ہی چنگا لگنا ایں''

''اے میرے اللہ! اکیلا تو تو ہی اچھا لگتا ہے۔'' اللہ اکبر!

تو محبت اور غم بندے کو مانگنا سکھا دیتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں محبت ہوگی تو ہمیں مانگنا آجائے گا۔ اللہ اکبر!

ایک تائب کی عجیب دعا:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک آدمی جس نے سچی توبہ کی، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگا، دعا بھی اس نے کیا غضب کی مانگی! توجہ فرمایئے! دعا مانگتے ہوئے کہنے لگا:

''یَا رَبِّ اَنْتَ تَعْلَمُ اَنِّیْ اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَاِنْ لَمْ اَکُنْ صَالِحًا''

''اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اگرچہ میں خود نیک نہیں بن سکا۔''

''وَیَا رَبِّ اَنْتَ تَعْلَمُ اَنِّیْ اَکْرَہُ الْفَاسِقِیْنَ وَاِنْ کُنْتُ فَاسِقًا''

''اور اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں فاسقوں کو پسند نہیں کرتا، اگرچہ (اپنے نفس

کی وجہ سے) میں خود فاسق بن چکا ہوں۔''

''یَا رَبِّ لَوْ اَعْلَمُ اَنَّ دَخُوْلَ الْجَنَّةِ یَزِیْدُ فِیْ مُلْكِكَ شَیْئًا مَا سَئَلْتُكَ الْجَنَّةَ''

''یا رب! اگر میں جانتا کہ میرا جنت میں جانا تیرے ملک میں کوئی زیادتی کردے گا تو میں جنت میں جانے کی دعا کبھی نہ مانگتا۔''

''وَ لَوْ اَعْلَمُ اَنَّ نَجَاةً مِنَ النَّارِ تَنْقُصُ مِنْ مُلْكِكَ شَیْئًا مَا سَئَلْتُكَ النِّجَاةَ''

''اور اگر میں جانتا کہ جہنم سے نجات پانے میں تیرے ملک میں کوئی کمی ہو جاتی تو میں تجھ سے جہنم کی نجات نہ مانگتا۔''

مجھے پتا ہے کہ تیرے ملک میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی ہو سکتی ہے۔ ہاں! مجھے بخش دے گا تو میرا بھلا ہو جائے گا۔

''یَا رَبِّ اِنْ لَمْ تَرْحَمْنِیْ اَنْتَ فَمَنْ یَرْحَمُنِیْ؟''

''اے اللہ! اگر تو مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو پھر کون ہے جو مجھ پر رحم کرے؟''

اللہ اکبر! کیسی دعا مانگی! دل سے جب بندہ دعا مانگتا ہے تو پھر اللہ کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ پھر خیر کا معاملہ فرماتے ہیں۔

ایک غمزدہ لڑکی کی دعا:

اصمعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ قبرستان کے قریب سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی اپنے ماں باپ کی قبر کے قریب کھڑی دعا مانگ رہی ہے، مگر اس کی دعا بڑی عجیب تھی۔ یعنی دعا کے جو الفاظ اس نے استعمال کیے، وہ بڑے عجیب

تھے۔ کہتی ہے:

”اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ کَائِنٌ قَبْلَ کُلِّ شَیْئٍ“

”اے اللہ! ہر چیز سے پہلے آپ موجود تھے۔“

”وَاِنَّکَ کَائِنٌ بَعْدَ کُلِّ شَیْئٍ“

”اور ہر چیز کے بعد بھی آپ ہی موجود ہوں گے۔“

”وَاِنَّکَ خَالِقُ کُلِّ شَیْئٍ“

”اور ہر چیز کے خالق بھی آپ ہیں۔“

”وَ اِنَّکَ یَا رَبِّ قَدْ خَلَقْتَنِیْ اَبَوَیَّ مِنْ قَبْلُ ثُمَّ خَلَقْتَنِیْ بَعْدَھُمَا مِنْھُمَا“

”آپ نے مجھ سے پہلے میرے ماں باپ کو پیدا کیا، پھر ان ماں باپ سے آپ نے مجھے پیدا کیا۔“

”وَاِنَّکَ اٰنَسْتَنِیْ بِھِمَا مَا شِئْتَ“

”اور پھر آپ نے مجھے ماں باپ کی محبت عطا فرما دی۔“

(پھر والدین کی وفات ہوگئی ہے۔)

”ثُمَّ اَوْھَشْتَنِیْ مِنْھُمَا اِذَا شِئْتَ“

”اب آپ ہی چاہیں تو میرے دل سے میری وہ محبت ختم کر سکتے ہیں۔“

”اَللّٰھُمَّ فَکُنْ لَھُمَا رَاحِمًا وَ کُنْ لِیْ بَعْدَھُمَا حَافِظًا“

”اے اللہ! ان دونوں پر آپ رحمت فرما دیجیے اور ان دونوں کے بعد میری حفاظت فرما دیجیے۔“

اللہ اکبر!! یہ محبت عجیب چیز ہے، بندے کو مانگنا سکھا دیتی ہے۔

اللہ سے اللہ کی محبت میں ڈوب کر مانگیں:

اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتے ہیں کہ میرے بندے میری محبت میں ڈوب کر مجھ سے مانگیں، جو مانگیں گے میں پروردگار ان کو عطا کر دوں گا۔ لہٰذا ہم اس رمضان المبارک کی راتوں میں چند ہی تو رہ گئی ہیں، اللہ رب العزت سے دعائیں مانگیں۔ اپنے لیے آخرت مانگیں، اُمت کے لیے دعائیں مانگیں، اللہ رب العزت ہمارے اوپر رحمت کی نظر فرمائے اور ہماری تمام پریشانیوں کو اللہ دور فرما دے۔ (آمین ثم آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اختتامِ بخاری شریف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ:
وَ بِالسَّنَدِ الْمُتَّصِلِ مِنِّیْ اِلَی الْاِمَامِ الْھُمَّامِ یَقُوْلُ الْعَبْدُ الْفَقِیْرُ ذُوْالْفِقَار اَحْمَدُ حَدَّثَنِیْ حَضْرَۃُ الْاُسْتَاذُ حَافِظُ الْقُرْآنِ وَ الْحَدِیْثِ مَوْلَانَا مُحَمَّدْ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدْ اَمِیْر قَالَ حَدَّثَنِیْ حَضْرَۃُ الْاُسْتَاذُ مَوْلَانَا شَیْخُ مُحَمَّدْ مَالِكْ کَانْدھلَوِیْ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ مُحَمَّدْ اِدْرِیْس قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ مُحَمَّدْ اِسْمٰعِیْل قَالَ حَدَّثَنِیْ عَلِیٌّ بْنُ الظَّاھِرِ الْوَتْرِیْ الْمَدَنِیْ قَالَ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدْ عَابِدْ قَالَ حَدَّثَنِیْ صَالِحُ الْعُمْرِیْ قَالَ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ سَنَۃَ الْعُمْرِیْ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَحْمَدُ بْنُ الْعَجَلِیْ قَالَ حَدَّثَنِیْ قُطْبُ الدِّیْنْ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ الْمُعَمَّرُ الشَّیْخُ یُوْسُفُ ھَرَوِیْ اَلْمَشْھُوْرُ بِسِہٖ صَدْ سَالَہ قَالَ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ شَاذْ قَالَ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی بْنُ عَمَّارٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ یُوْسُفَ الْفِرَبْرِیْ رَحِمَھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی رَحْمَۃً وَّ اسِعَۃً قَالَ حَدَّثَنِیْ الشَّیْخُ الْاِمَامُ الْحَافِظُ الْحُجَّۃُ اَمِیْرُ

الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الْحَدِيْثِ وَ سَيِّدُ الْمُحَدِّثِيْنَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمٰعِيْلَ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ الْجُعْفِيِّ الْبُخَارِيْ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

بَابُ: قَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى: {وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ} وَ اَنَّ اَعْمَالَ بَنِيْ آدَمَ وَ قَوْلَهُمْ يُوْزَنُ وَ قَالَ مُجَاهِدٌ: الْقِسْطَاسُ الْعَدْلُ بِالرُّوْمِيَّةِ وَ يُقَالُ: اَلْقِسْطُ مَصْدَرُ الْمُقْسِطِ وَ هُوَ الْعَادِلُ وَ اَمَّا الْقَاسِطُ فَهُوَ الْجَائِرُ. حَدَّثَنِيْ اَحْمَدُ بْنُ اِشْكَابٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ عَنْ عُمَّارَةَ بْنِ الْقَعْقَاعِ عَنْ اَبِيْ زُرْعَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ»

بخاری شریف کی آخری حدیث مبارکہ کی تلاوت کی گئی۔ اس حدیث مبارکہ میں قیامت کے دن انسان کے اعمال کو تولنے کا تذکرہ ہے۔ طلبہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ قیامت کا تصور تمام اُمتوں میں رہا ہے، مگر اجمالی طور پر تھا۔ قیامت کے دن کا تفصیلی علم اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمایا ہے۔ قیامت آنے سے پہلے کی چھوٹی اور بڑی علامات کیا ہوں گی؟ نبی علیہ السلام نے وہ ساری کی ساری تفصیل کے ساتھ بتائی ہیں۔ پھر قیامت کے دن کیا ہوگا؟ اس کی بھی تفصیلات بتائی ہیں۔ جتنی قیامت کی تفصیل اس امت کو بتائی گئی، اس سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئی۔

قیامت کیسے آئے گی؟

یہاں ایک طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کیسے آئے گی؟ تو مومن کے ذہن میں تو اس کا آسان سا جواب ہے کہ اللہ کے حکم سے آئے گی۔ ایک فرشتہ اسرافیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے صور پھونکے گا اور اس صور کی آواز اتنی تیز ہو جائے گی کہ جس کی وجہ سے کائنات کا نظام ہی تہہ و بالا ہو جائے گا۔ چاند، ستارے، سورج سب ٹوٹ جائیں گے...... پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑنا شروع کردیں گے...... زمین بالکل چپٹی ہو جائے گی...... اس طرح قیامت قائم ہو جائے گی۔ لیکن جو لوگ مادہ پرست ہیں اور سائنس کی نظر رکھنے والے ہیں، ان کے اپنے الگ نظریات ہوتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ دہریے ہوں تو بھی مانتے ہیں کہ قیامت آئے گی، اس بات پر سب متفق ہیں۔ مومن تو مانتے ہی ہیں، کافر بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ قیامت آئے گی، لیکن کیسے آئے گی؟ اس میں اختلاف ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی سوچ مادی ہوتی ہے، وہ مادے کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

چنانچہ سائنسدانوں نے لکھا ہے کہ قیامت آنے کے چار امکانات ہیں:

پہلا امکان:

ایک امکان تو یہ ہے کہ سورج اپنی مدتِ حیات کو مکمل کرلے گا۔ سورج کی عمر پانچ بلین سال ہے۔ سورج کے اندر ہائیڈروجن گیس ہے اور وہ ہیلیم گیس میں بدل رہی ہے۔ جب ہائیڈروجن گیس ہیلیم گیس میں بدلتی ہے تو ہم اس کو اٹامک بم کہتے ہیں۔ تو جیسے بم پھٹتا ہے تو بہت آگ نکلتی ہے، سورج میں اسی طرح ہائیڈروجن، ہیلیم میں تبدیل ہو رہی ہے اور بہت زیادہ آگ نکل رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ سورج کا

ٹمپریچر 20 ملین سینٹی گریڈ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتا جائے گا اور ایک وقت آئے گا کہ یہ ٹمپریچر 100 ملین سینٹی گریڈ تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت سورج بالکل سرخ دیو نظر آئے گا اور سورج کی اس گرمی کی وجہ سے ساری زمین کا نظام تباہ ہو جائے گا۔

دوسرا امکان:

دوسرا امکان یہ ہے کہ کوئی چیز زمین کے ساتھ ٹکرا جائے گی، مثال کے طور پر: شہابِ ثاقب۔ شہابِ ثاقب کیا ہیں؟ اگر آپ نے رات کے وقت آسمان کی طرف دیکھا ہو تو کچھ ستارے ٹوٹتے نظر آتے ہیں، وہ ستارے نہیں ہوتے، بلکہ وہ Metroits (شہابِ ثاقب) ہوتے ہیں۔ یہ کچھ ذرّات ہوتے ہیں جو زمین کی طرف آتے ہیں، لیکن جب وہ ہوا میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی سپیڈ اتنی ہوتی ہے کہ ان کو آگ لگ جاتی ہے اور وہ ہمیں ستارے کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ شہابِ ثاقب روزانہ زمین پر گر رہے ہیں۔ سائنسدانوں کے اعتبار سے ہر روز ایک ہزار ٹن شہاب ثاقب زمین پر برستے ہیں۔

1918ء میں ایک مرتبہ سائبیریا میں ایک مقام تنکستہ میں ایک شہابِ ثاقب گرا، اس کی پاور ایٹم بم سے دس ہزار گنا بڑی تھی، لیکن چونکہ وہاں ساری برف ہی برف ہے، اس لیے آگ کا اتنا زیادہ نقصان سامنے نہ آسکا۔ تو سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ بھی امکان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ایک شہابِ ثاقب زمین پر گرے گا اور زمین کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔

تیسرا امکان:

ایک اور امکان یہ ہے کہ کوئی ستارہ زمین کے قریب سے گزرے گا۔ کچھ ستارے ایسے ہیں جو زمین کے قریب سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ 1993ء میں ایک دُم

دارستارہ جس کا نام ''ہیلے کومٹ'' تھا، وہ زمین کے بہت قریب سے گزرا۔ سائنسدان یہ کہتے ہیں کہ اب 21 اگست 2126ء میں وہ چالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کے ساتھ آکر ٹکرائے گا۔ آپ بتائیں کہ کوئی سیارہ یا ستارہ چالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آکر اگر زمین سے ٹکرائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ ستارہ ہر سیکنڈ میں دس میل زمین کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

سائنسدانوں نے ایک ٹیلی اسکوپ (دوربین) خلا میں بھیجی ہوئی ہے، اس کا نام ہے ''ہبل''۔ اس نے 63 ملین نوری سال پہلے کی کہکشاؤں کے تصادم کی تصاویر بھیجی ہیں۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کہکشائیں آپس میں ٹکرا بھی سکتی ہیں۔

چوتھا امکان:

اور ایک امکان یہ بھی ہے کہ کوئی Black Whole (بلیک ہول) ہمارے اس نظام کو اپنے اندر ہضم کر لے گا۔ اس کا بھی حدیثِ پاک سے ثبوت ملتا ہے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں: اگر سورج، چاند اور ستارے اللہ کا حکم ماننا چھوڑ دیں تو کیا ہوگا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے جانوروں میں سے کوئی جانور ان پر مسلط کر دیں گے، جو اُن کو ایک لقمہ بنا لے گا۔ صحابی رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر پوچھا: وہ جانور کہاں پائے جاتے ہیں؟ فرمایا: وہ اللہ کی چراگاہوں میں چرتے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے ان کو ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق جواب دے دیا، لیکن اب سائنسدان کہتے ہیں کہ ان جانوروں سے مراد بلیک ہول ہیں اور یہ اتنے بڑے ہیں کہ اگر زمین ان کے اندر چلی جائے تو پتا بھی نہ چلے کہ وہ کہاں گئی؟

چنانچہ دو بلیک ہول زمین کے قریب ہیں۔

ایک کا نام ہے: Old a star black whole

اور دوسرے کا نام ہے: Old facufull black whole

کائنات کا انجام:

ہم لوگ ایک مرتبہ امریکہ میں ایک سائنس میوزیم دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک سوال لکھا ہوا تھا:

What is the fate of universe?

''کائنات کا انجام کیا ہے؟''

یہ سوال پڑھ کر مجھے ذرا حیرت ہوئی کہ دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ اس کا جواب کیا دیتے ہیں۔ تو وہاں کے سائنسدانوں نے یہ کہا کہ اصل میں جب کائنات بنی تو ایک دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کو سائنسدان Big Bang (بِگ بینگ) کہتے ہیں اور اس تھیوری کا نام ہے: بِگ بینگ تھیوری۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ کائنات اللہ کے حکم سے قائم ہوئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾[یٰسٓ:۸۲]

''اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لے تو صرف اتنا کہتا ہے کہ ہو جا، بس وہ ہو جاتی ہے۔''

وہ لوگ چونکہ دہریے ہوتے ہیں، اس لیے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تو وہ کہتے ہیں کہ دھماکا ہوا اور اس کی وجہ سے یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ بہرحال! یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ دھماکے کے ساتھ کائنات وجود میں آئی اور پھر اس نے پھیلنا شروع کر دیا۔ کائنات کے پھیلنے کا تصور قرآنِ پاک سے بھی ثابت ہے۔ فرمایا:

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾[الذاریات:۴۷]

''اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا ہے، اور ہم یقیناً وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔''

سائنسدان یہ مانتے ہیں کہ کائنات وسیع ہوتی چلی جارہی ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ ایک دوسرے سے دور جانے والی چیزیں، کہیں جا کر بیلنس ہوگا تو رکیں گی اور رکنے کے بعد یہ مرکز کی طرف واپس کھنچیں گی۔ جیسے کوئی ربڑ ہوتا ہے، اس کو کھینچا جائے تو چھوڑنے پر وہ واپس اپنے مرکز کی طرف لوٹتا ہے۔ اسی طرح جو چیزیں پھیل رہی ہیں، ایک وقت آئے گا کہ یہ کھنچیں گی اور واپس مرکز کی طرف آئیں گی، اور جب مرکز کی طرف آئیں گی تو یہ آپس میں ٹکرائیں گی اور ایک نیا دھماکا ہوگا۔ اس کو An other big bang کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

An other big bang is the fate of universe?

''ایک اور بڑا دھماکہ ہوگا جس کے بعد کائنات کا انجام ہوجائے گا۔''

تو جو شریعت نے کہا گویا سائنسدان اسی کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک دھماکہ ہوگا اور اس کے بعد یہ کائنات برباد ہوجائے گی۔ چنانچہ قیامت کی تفصیلات اللہ نے اس اُمت کو بہت تفصیل کے ساتھ عطا فرمائیں۔

روزِ قیامت اعمال کو تولا جائے گا:

نبی علیہ السلام نے فرمایا: جب قیامت قائم ہوگی تو اس دن انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا۔ اب یہ عجیب سی بات ہے کہ انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا، مگر عقلِ سلیم اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔

آپ غور کریں کہ اگر کوئی بندہ اس دنیا میں بدکاری کی زندگی گزارتا ہے اور اس میں کوئی لحاظ نہیں کرتا تو ایک وقت آنا چاہیے کہ جس میں اس کو اس کی بدکاری کی سزا ملے۔ اور ایک بندہ اگر نیکوکاری کی زندگی گزارتا ہے، اپنے نفس پر جبر کرتا ہے، مجاہدہ کرتا ہے،

کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا تو اس بات کا وہ حق دار ہے کہ کوئی ایسا دن ہو جس میں اس کو اس کا اجر دیا جائے۔ تو جزا اور سزا کا ملنا، اس کو عقلِ سلیم بھی تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ قیامت کا دن جزا اور سزا کا دن ہوگا، اس دن اللہ تعالیٰ نیکوں کو ان کی جزا دیں گے اور بُروں کو اللہ تعالیٰ ان کی بداعمالیوں کی سزا دیں گے۔

معتزلہ کے اعتراض کا رد:

اب یہ جزا اور سزا کا معاملہ ہوگا کیسے؟ اس دن اللہ تعالیٰ میزان پر بندے کے اعمال کو تولیں گے۔ اس اُمت کے شروع زمانے میں ایک ایسا گروہ بھی گزرا ہے جس کو معتزلہ کہا جاتا ہے۔ معتزلہ اعتزال سے ہے۔ یعنی یہ وہ گروپ تھا جو عقل پرست تھا اور کہتا تھا کہ جو بات عقل میں آئے، اس کو قبول کرو اور جو عقل میں نہ آئے، اس کو قبول نہ کرو۔ وہ کہتے تھے کہ اعمال کوئی مجسم چیز تو ہیں نہیں، ان کو کیسے تولا جا سکتا ہے؟ مگر یہ ان کی بے وقوفی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ سائنس نے ثابت کر دیا کہ کئی ایسی چیزوں کو تول لیا جاتا ہے جن کو پہلے زمانے میں نہیں تولا جا سکتا تھا۔ آپ دیکھیں! آج کے دور میں ہم انسان کے بلڈ پریشر کو تول لیتے ہیں کہ کتنا ہے، کسی بندے کے اندر شوگر لیول کو تول لیتے ہیں، کسی چیز کا درجہ حرارت معلوم کر لیتے ہیں۔ پہلے ایک زمانہ تھا کہ یہ چیزیں نہیں معلوم کی جا سکتی تھیں، لیکن اب اس کے لیے سائنس نے طریقے نکال لیے، مشینیں ایجاد کیں، جن سے ان کی پیمائش ہو جاتی ہے۔

میزان کیسا ہوگا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ میزان کیسا ہوگا؟ تو میزان مختلف ہوتے ہیں، گندم اور چاول تولنے کے لیے جو میزان (ترازو) ہوتا ہے، وہ مختلف ہوتا ہے اور جو سونے اور چاندی کو تولتا ہے وہ میزان مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ زبان دان ہیں اور زبان پڑھتے ہیں، وہ

سمجھتے ہیں کہ صرف ونحو کے میزان مختلف ہوتے ہیں۔ تو میزان کی حقیقت مختلف ہوسکتی ہے۔ لیکن بہرحال اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میزانِ عدل قائم فرمائیں گے اور اس پر انسانوں کے اعمال کو تولیں گے۔

علم کو نہیں عمل کو تولا جائے گا:

یہاں طلبہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ((اَعْمَالُ بَنِیْ آدَمَ یُوْزَنُ)) فرمایا گیا کہ ان کے اعمال کو تولا جائے گا، یعنی صرف علم کو نہیں تولا جائے گا۔ طلبہ اس بات پر خوش نہ ہوں کہ ہم نے علم پڑھ لیا، یہ یاد رکھیں کہ اب اس علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا پڑے گا، پھر یہ میزان پر ہمیں فائدہ دے گا۔

اعمال کا وزن انسان کے اخلاص کے بقدر ہوگا:

اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ میزان کے اندر جو چیز آئے گی وہ بھاری بھی ہوسکتی ہے اور ہلکی بھی ہوسکتی ہے۔ بھاری ہوگی اگر انسان کے اندر اخلاص ہوگا، ہلکی ہوگی اگر اس کے اندر اخلاص نہیں ہوگا۔ جتنا اخلاص زیادہ اتنا وزن زیادہ، جتنا اخلاص کم اتنا وزن کم ہوگا۔ اور چونکہ کافر لوگوں کے دلوں میں اخلاص ہی نہیں ہوتا اور ایمان ہی نہیں ہوتا تو قیامت کے دن ان کے اعمال بے وزن ہوجائیں گے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الکہف:۱۰۵]

''چنانچہ قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن شمار نہیں کریں گے۔''

کافر کو اعمال کا اجر کیوں نہیں ملتا؟

اب یہاں بعض لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ مسلمان اگر نیکی کرے تو اس کو اس پر اجر

ملتا ہے اور اگر کافر وہی نیکی کرے تو اس کو اجر کیوں نہیں ملتا؟ ہم نے کہا: اس لیے کہ اس کے پاس ایمان ہی نہیں ہوتا، مگر دہریہ قسم کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی۔

عقلی دلیل:

ایک مرتبہ یونیورسٹی میں ایک دہریہ میرے پاس آیا۔ کہنے لگا: اسلام میں انصاف نہیں ہے۔ میں نے کہا: تمہاری رائے ہوگی۔ کہنے لگا: ہاں! میری رائے تو یہی ہے۔ میں نے کہا: کیسے؟ کہنے لگا: ایک نیکی کا کام آپ کرتے ہیں، مثلاً: کسی کی پریشانی کو دور کرتے ہیں، آپ مسلمان ہیں اس لیے آپ کو اجر ملے گا اور وہی کام ایک کافر کرتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ اس کو اجر نہیں ملے گا۔ میں نے کہا: ہاں! بالکل ٹھیک کہا۔ کہنے لگا: یہی تو ناانصافی ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں کو اجر دیتے ہیں اور کافر کو نہیں دیتے۔ میں نے کہا: اچھا! آپ کیا چاہتے ہیں؟ کہنے لگا: مجھے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہیں چاہیے، بلکہ مجھے عقل سے دلیل دیں کہ ان کو کیوں اجر نہیں ملے گا؟ میں نے کہا: اچھا بتائیں کہ آپ کے پاس پین اور کاغذ ہے؟ کہنے لگا: ہاں۔ میں نے کہا: لکھنا شروع کرو اور ایک لکھ کر اس کے آگے ۲۰ دفعہ زیرو لگادو۔ اس نے لکھ دیا۔ میں نے کہا: اس کی ویلیو کیا ہے؟ کہنے لگا: اس کی ویلیو تو بہت زیادہ ہوگئی۔ میں نے کہا: اب ۲۰ دفعہ صرف زیرو لکھو۔ اس نے لکھ دیے۔ میں نے کہا: اس کی ویلیو کیا ہے؟ کہنے لگا: زیرو۔ میں نے کہا: یہ کیا بات ہوئی کہ جتنے عدد پہلے لکھے تھے اتنے اب بھی لکھے، جتنا پین پہلے چلا تھا اتنا اب بھی چلا، پہلے کی ویلیو اربوں کھربوں میں پہنچ گئی اور اس کی ویلیو زیرو کی زیرو رہی؟ کہنے لگا: اصل میں آپ نے اس کے شروع میں ایک نہیں لکھوایا، اس لیے اس کی ویلیو زیرو ہی رہی۔ میں نے کہا: یہی فرق ہے کہ مومن جب اللہ پر ایمان لے آتا ہے تو گویا شروع میں وہ ایک لکھ لیتا ہے، اللہ کی توحید کا اقرار کر لیتا ہے، اس کے بعد جتنے

اعمال کرتا ہے، ان اعمال کی ویلیو بڑھتی رہتی ہے اور قیامت کے دن اس کو بہت بڑا اجر نصیب ہوگا اور کافر چونکہ ایمان لاتا ہی نہیں، اس لیے اس کے سارے اعمال زیرو زیرو ہی ہیں، لہٰذا ان کا وزن زیرو ہی ہوگا۔

سائنسی دلیل:

مگر آج کے دور میں اس بات کو اور زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر: اگر ایک بندے کا وزن زمین کے اوپر ایک سو کلوگرام ہے، یہی بندہ اگر چاند پر چلا جائے تو اس کا وزن وہاں چالیس کلوگرام رہ جائے گا۔ بندہ وہی ہے، مگر وزن چالیس کلوگرام ہو جائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وزن کا فارمولا ہے:

$W = mg$

انسان کی کمیت کو Gravitational Force (کشش ثقل) کے ساتھ ضرب دیتے ہیں۔ اب یہاں زمین کی کششِ ثقل زیادہ ہے تو بندے کا وزن سو کلو، چاند پر جائے تو چالیس کلو اور وہی بندہ مریخ پر چلا جائے تو اس کا وزن چار سو کلو ہو جائے گا، حالانکہ بندہ وہی ہے۔ اور اگر وہی بندہ خلاء میں چلا جائے تو اس کا وزن زیرو کلو ہوگا۔ وزن ہی ختم ہو جائے گا۔ خلاء کے اندر بندے کا وزن نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلاء کے اندر کوئی کشش ثقل نہیں ہوتی۔ اب بتائیں کہ جہاں کشش ثقل نہیں تھی، اچھا بھلا بندہ ہے، لیکن اس کا وزن زیرو ہو گیا۔ بالکل اسی طرح چونکہ کافر کے دل میں اللہ تعالیٰ کے ایمان کی کشش نہیں ہوتی، لہٰذا ان کے جتنے بھی اعمال ہوں گے، ان کا وزن قیامت کے دن زیرو ہوگا اور مومن کے دل میں چونکہ اللہ کی محبت ہوتی ہے، لہٰذا قیامت کے دن اس کے اعمال کا وزن بہت بھاری ہوگا۔

تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال کو تولیں گے، کچھ اعمال زیادہ وزنی

ہوں گے اور کچھ کم وزن کے ہوں گے اور اس دن انسان کے انجام کا فیصلہ ہوگا۔

موازین میں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا؟

آگے فرمایا:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [الانبیاء:۴۷]

"اور ہم قیامت کے دن ایسی ترازو لا رکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی۔"

یہ مَوَازِیْن، مِیْزَان کی جمع ہے، یعنی بہت سارے ترازو۔ اب بھائی! میزان تو ایک ہوگا۔ حدیث پاک میں ہے:

"قیامت کے دن ترازو کو رکھا جائے گا، اگر اس میں آسمانوں و زمین کا وزن بھی کیا جائے تو سما جائیں۔" [المستدرك على الصحيحين، حديث:۸۷۳۹]

پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے؟ محدثین نے جواب دیا کہ چونکہ انسان بہت زیادہ ہوں گے، اس لیے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ بعض محدثین نے کہا کہ چونکہ انسانوں کے اعمال مختلف قسم کے ہوں گے اور بہت زیادہ ہوں گے، اس لیے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اور بعض محدثین نے کہا کہ نہیں، یہ تفخیم (عزت و احترام) کے لیے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اور انہوں نے اس کی قرآنِ پاک میں سے مثال دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الشعراء:۱۰۵]

"نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔"

اب نوح علیہ السلام تو ایک پیغمبر تھے، لیکن اکرام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے لیے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا، اسی طرح اکرام کے طور پر اللہ نے میزان کے لیے موازین کا صیغہ

استعمال فرمایا۔ ہم بھی ایک دوسرے کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے اکرام کے لیے "آپ"، یعنی جمع کا صیغہ استعمال کر لیتے ہیں۔

مِیزَان اصل میں مِوْزَان تھا۔ یہاں قانون لگا، واؤ سے پہلے چونکہ کسرہ تھا، اس لیے اس کو "ی" کے ساتھ بدل دیا گیا تو یہ مِیزَان بن گیا اور مِیزَان سے مَوَازِین بن گیا۔

وزنِ اعمال سے استثنیٰ کن لوگوں کو؟

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال کو تولیں گے۔ ظاہر میں یہاں تعمیم نظر آتی ہے کہ سارے انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا، لیکن حدیث پاک سے ثابت ہے کہ کچھ بندوں کے اعمال کو نہیں تولا جائے گا۔ وہ مسلمان جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے، اللہ تعالیٰ بلا حساب ان کو جنت عطا فرمائیں گے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "میں نے اپنے رب کو سخی اور کریم پایا کہ ستر ہزار افراد کو جنت میں داخل فرمائیں گے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار عطا فرمائے۔ میں نے عرض کیا: میری امت اس تعداد کو نہیں پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اعراب یعنی دیہات کے رہنے والوں سے اس تعداد کو پورا کروں گا۔"

[مجمع الزوائد، حدیث: ۱۸۷۱۱]

تو اس حدیث سے پتا چلا کہ کچھ ایمان والے ایسے ہوں گے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، یہ بات محبت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے محبت کرتے ہیں قیامت کے دن ان کا حساب ہی نہیں لیں گے، اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے ہوئے حیا آئے گی۔

ہماری علاقائی زبان میں ایک بزرگ نے شعر کہا:

سارے پھل گلاب نہ ہوندے
تے کورے کاغذ کتاب نہ ہوندے
تے جے کر یاری لایئے بلھیا
تے یاراں نال حساب نہ ہوندے

انسان اگر کسی سے محبت کرتا ہے تو محبت کی وجہ سے اس سے حساب لیتے ہوئے شرماتا ہے تو جو لوگ اس دنیا میں اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کا حساب نہیں لیں گے، ان کو بلا حساب جنت عطا فرما دیں گے۔

ایک گروپ کافروں کا ہوگا جن کے ذمہ حقوق العباد نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کو بلا حساب جہنم میں بھیج دیں گے۔ ان کا حساب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حقوق العباد تو ہیں نہیں۔ انہوں نے تو اللہ کو نہیں مانا، لہٰذا اب بلا حساب جہنم میں جائیں گے۔ باقی جتنے ہوں گے، ان کا حساب ہوگا اور ان کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، یا جنت میں جائیں گے یا جہنم میں جائیں گے۔

میزان پر کیا تولیں گے؟

یہاں پر ایک نکتہ اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ محدثین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال کو تولا جائے گا یا نامۂ اعمال کو تولا جائے گا یا خود بندے کو تولا جائے گا۔ یہ تین امکانات ہیں۔ حدیث پاک سے تینوں کا ثبوت ملتا ہے۔

۞ ...... ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اعمال تولے جائیں گے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز مومن کے میزان میں حسنِ اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۰۲]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعمال کو تولا جائے گا۔

۞......اور ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نامۂ اعمال کو تولا جائے گا۔ چنانچہ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک شخص کو میری اُمت سے جدا کرے گا اور اس کے گناہوں کے ننانوے دفتر کھولے جائیں گے۔ ہر دفتر اتنا بڑا ہوگا جہاں تک انسان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے اس میں سے کسی کا انکار ہے؟ کیا میرے لکھنے والے محافظ فرشتوں نے تجھ پر ظلم کیا ہے؟ وہ عرض کرے گا: نہیں اے پروردگار! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے آج تجھ پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس پر کلمہ شہادت لکھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میزان کے پاس حاضر ہوجا۔ وہ کہے گا: یا اللہ! ان دفتروں کے سامنے اس چھوٹے سے کاغذ کا کیا وزن ہوگا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج تم پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر ایک پلڑے میں وہ ننانوے دفتر رکھ دیئے جائیں گے اور دوسرے پلڑے میں کاغذ کا وہ پرزہ رکھا جائے گا۔ دفتروں کا پلڑا ہلکا ہوجائے گا جبکہ کاغذ (کا پلڑا) بھاری ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اور اللہ کے نام کے برابر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔'' [جامع ترمذی، حدیث: ۲۶۳۹]

تو اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نامۂ اعمال کو بھی تولا جائے گا۔

۞......اور ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خود بندے کو تولا جائے گا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک بڑے عالم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کو امام الفقہاء کہا جاتا ہے۔ بہت بڑے فقیہ تھے، لیکن اللہ کی شان کہ بڑے دبلے پتلے تھے۔ ان کی پنڈلیاں اور بھی پتلی تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی پتلی پنڈلیوں کو دیکھ کر کئی مرتبہ ہنستے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو وہ درخت پر

چڑھ گئے، نبی ﷺ نے انہیں کچھ لانے کا حکم دیا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کی پنڈلی پر بھی نظر پڑی، وہ ان کی پتلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنس پڑے، نبی ﷺ نے فرمایا: کیوں ہنس رہے ہو؟ یقیناً عبداللہ کا ایک پاؤں قیامت کے دن میزانِ عمل میں اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہوگا۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۹۲۰]

تو اس سے پتا چلتا ہے کہ بندے کو بھی تولا جائے گا۔ اب محدثین نے کہا کہ امکانات تینوں ہیں۔ کس کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ اللہ جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا منصف بھی اور مالک بھی:

اب اس بات کو بھی ذرا سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے منصف بھی ہیں اور قیامت کے دن کے مالک بھی ہیں...... جو جج ہوتا ہے اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا، بلکہ وہ قانون کا پابند ہوتا ہے۔ وہ کسی کی فیور کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا، چونکہ قانون آڑے آتا ہے...... اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے منصف بھی ہیں، مگر قیامت کے دن کے مالک بھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جس کے ساتھ چاہیں گے، نرمی کا معاملہ فرمائیں گے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ امکانات تینوں ہیں، اللہ تعالیٰ بندے کو دیکھیں گے، اگر اعمال تولنے سے وہ پاس ہوسکتا ہے تو اعمال کو اس کا ذریعہ بنا دیں گے۔ اگر اس کے دفتر تولنے سے وہ کامیاب ہوسکتا ہے تو کہا جائے گا کہ اس کے نامۂ اعمال کو تولو اور اگر اس بندے کو تولنے سے مغفرت ہوسکتی ہے تو کہیں گے کہ بندے کو تولو۔ مقصد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کے اُمتی کو کسی نہ کسی صورت جنت میں بھیج دیں گے اور اس کو میزان سے نجات عطا فرما دیں گے۔

علماء سے خصوصی معاملہ:

اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بھی خیر کا معاملہ فرمائے اور ہمیں قیامت کے دن ان میں شامل فرمائے جو بلاحساب جنت میں جائیں گے۔ اس لیے کہ میرے دوستو! ہم تو میزان پر پورے نہیں اُتر سکتے، ہم حساب اور ناپ تول کے قابل نہیں ہیں، بس ہم اللہ سے یہی دعا مانگتے ہیں: اللہ! ہمارے ساتھ خیر کا معاملہ فرما دے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب اپنے بندوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے تو علماء سے فرمائیں گے:

((إِنِّي لَمْ أَجْعَلْ عِلْمِي وَحِلْمِي فِيكُمْ إِلَّا وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أَغْفِرَ لَكُمْ عَلَى مَا كَانَ فِيكُمْ وَلَا أُبَالِي)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث:۱۳۸۱]

''میں نے تمہارے دلوں میں اپنا علم اور حلم اس لیے ودیعت کیا ہے، تاکہ تمہاری مغفرت کروں اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔''

میں نے تمہارے سینوں میں علم کو اس لیے نہیں اُتارا تھا کہ آج میں تمہیں لوگوں کے سامنے رُسوا کروں، آؤ! میں نے تمہیں بلا حساب جنت عطا فرما دی۔ اللہ کرے ہم بھی طالب علم بن کر پیش ہوں اور ہمیں بھی اللہ تعالیٰ بلاحساب جنت عطا فرما دے۔

قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ:

وَقَالَ مُجَاهِدٌ: اَلْقُسْطَاسُ الْعَدْلُ بِالرُّوْمِيَّةِ

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''قُسطَاس'' رومی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنیٰ عدل ہے۔ اصل میں یہ لفظ تھا ''قُسطَار'' وقت کے ساتھ ساتھ ''قُسطَاس'' بن گیا اور عربوں نے اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ لفظ قرآنِ مجید میں بھی استعمال ہوا ہے۔

طالب علم کے ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قرآنِ پاک کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ○﴾ ''ایسی عربی زبان میں اُترا ہے جو پیغام کو واضح کر دینے والی ہے۔'' اس کتاب میں یہ رومی زبان کا لفظ کہاں سے آ گیا؟ چنانچہ بعض مفسرین نے سو سے زیادہ الفاظ کی نشان دہی کی ہے جو قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں، مگر دوسری زبانوں کے الفاظ تھے۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جب کوئی لفظ عربوں کی زبان کی میزان پر پورا اُتر گیا اور انہوں نے اس کا استعمال شروع کر دیا تو اب وہ غیر عربی لفظ نہیں کہلائے گا، بلکہ میزان پر پورا اُترنے کی وجہ سے اس کو عربی لفظ ہی کہیں گے۔

جن لوگوں نے کھیوڑہ میں نمک کی کان دیکھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ نمک کی کان کے اندر اگر کوئی درخت بھی ہو تو وہ بھی نمک کا بن جاتا ہے۔ ''ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد'' نمک کی کان میں جو چیز بھی جاتی ہے وہ نمک بن جاتی ہے۔ عربی زبان بھی ایسی زبان ہے کہ جو لفظ ان کے اصول پر پورا اُتر آیا اور استعمال ہونا شروع ہو گیا، اب ہم اس کو عربی لفظ ہی کہیں گے۔

یہ دو الفاظ ہیں: ایک ہے اَلْقِسْط، اس کا معنی ہوتا ہے عدل۔ اور ایک ہے اَلْقَسْط، اس کا معنی ہے ناانصافی۔ طلبہ غور کریں کہ لفظ ایک ہی ہے، لیکن صرف اعراب کی تبدیلی کی وجہ سے معنی میں کتنا فرق پڑ گیا۔ قِسْط سے مُقْسِط بنتا ہے، جس کا مطلب ہے عادل۔ چنانچہ اَلْمُقْسِطُ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل ہیں اور عدل کی صفت کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝۴۲﴾ [المائدۃ:۴۲]

''یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اور قَسْط کا معنیٰ ناانصافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن:۱۵]

''اور رہے وہ لوگ جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا الْقَاسِطُ فَهُوَ الْجَائِرُ

رُواتُ الحدیث

پھر اس کے بعد حدیث مبارکہ ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ طلبہ ذرا توجہ فرمائیں۔ پہلے ہم حدیث کے راویوں کے بارے میں کچھ بات کر لیتے ہیں۔

احمد بن اشکاب رحمۃ اللہ علیہ:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ہیں احمد بن اشکاب رحمۃ اللہ علیہ۔ مصریوں نے اشکاب کو شکیب بھی پڑھا ہے۔ ان کے بارے میں ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقات میں سے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

ثِقَةٌ مَأْمُوْنٌ صَدُوْقٌ ''یہ پکے بندے تھے، مامون تھے اور سچے تھے۔'' یعنی بڑے مضبوط راوی تھے۔

ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں کہا:

''كَانَ صَائِبُ الْحَدِيْثِ''

انہوں نے اس حدیث کو لیا محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''لَمْ اَرَ هٰذَا الْحَدِيْثَ اِلَّا مِنْ طَرِيْقَةٍ بِهٰذَا الْاِسْنَادِ''

''میں نے اس حدیث کو جہاں بھی دیکھا، یہ اسی (محمد بن فضیل کے) واسطے سے ہی روایت ہوئی ہے۔''

ابتدا بھی غریب، انتہا بھی غریب:

اللہ کی عجیب شان ہے کہ بعض احادیث اگرچہ بہت سارے صحابہ کو یاد تھیں، لیکن ان کو روایت ایک ہی نے کیا۔ جیسے بخاری شریف کی پہلی حدیث:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ))

وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، کسی اور صحابی نے روایت نہیں کی۔ اور حدیث کا اصول ہے کہ جب کسی طبقہ میں ایک ہی راوی ہو تو وہ حدیث سند کے اعتبار سے غریب کہلاتی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کی پہلی حدیث بھی سند کے اعتبار سے غریب کہلاتی ہے اور یہ جو آخری حدیث ہے یہ بھی غریب کہلاتی ہے، کیونکہ اس میں ایک ہی راوی ہیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ''

''یہ حدیث حسن ہے، صحیح ہے، مگر غریب ہے۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شروع اور آخر میں یہ غریب سند والی احادیث کیوں پیش کیں؟ شاید امام بخاری طلبہ کو یہ میسج دینا چاہتے تھے کہ

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّ سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ))

عمارہ بن قعقاع رحمۃ اللہ علیہ:

پھر انہوں نے آگے یہ حدیث حاصل کی عمارہ بن قعقاع رحمۃ اللہ علیہ سے...... عمارہ بن

قعقاع رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے بڑے محدثین نے روایت لی ہے...... چنانچہ شیخ حارث عکلی اور سفیانین نے بھی ان سے روایت کی ہے، ابوحاتم نے کہا کہ وہ صالح الحدیث تھے، یحییٰ بن معین جو جرح اور تعدیل کے امام کہے جاتے ہیں، انہوں نے بھی ان کو ثقہ فرمایا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اتنی محبت تھی کہ فرماتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک جگہ تخلیہ ہو، تنہائی ہو، بس میں ہوں اور میرے استاد ہوں، وہ حدیث سنا رہے ہوں اور میں حدیث سن رہا ہوں، انہوں نے ان سے 30 احادیث روایت کی ہیں۔

ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ:

عمارہ ابن قعقاع رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ سے...... یہ تابعین میں سے تھے، کوفہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا اپنا نام تھا، عبدالرحمٰن، لیکن ابوزرعہ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ یہ ایسے خوش نصیب محدث ہیں جو فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک لاکھ حدیثیں اس طرح یاد ہیں جس طرح عام لوگوں کو سورۂ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ اور دیکھیے کہ اللہ نے ان کو موت بھی ایسی شاندار عطا فرمائی کہ انسان دل میں حسرت ہی کر سکتا ہے۔ جب وہ آخری لمحات میں تھے تو جو طلبہ پاس تھے، انہوں نے سوچا کہ ہم اپنے استاد کو کلمے کی تلقین کریں۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ ہم شاگرد ہیں اور یہ استاد ہیں، اب ان کو کیسے کلمہ پڑھنا یاد دلائیں؟ پھر اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جس حدیث پاک میں کلمے کا تذکرہ ہے، ہم کیوں نہ اس حدیث پاک کی تلاوت کریں؟ جب ہم اس حدیث کی تلاوت کریں گے تو استاد کو خود بخود یاد آجائے گا۔ چنانچہ انہوں نے حدیث کی تلاوت کرنی شروع کردی، جب انہوں نے دو چار راویوں کا نام لیا تو استاد کو

راویوں کے نام سے پتا چل گیا کہ یہ کون سی حدیث پڑھنا چاہتے ہیں؟ چنانچہ استاد نے وہ حدیث خود پڑھنی شروع کر دی......اور وہ حدیث یہ تھی:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ))

[سنن ابی داؤد، حدیث:۳۱۱۸]

''جس بندے کا آخری کلام (دنیا میں) لا الہ الا اللہ ہوگا، وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔''

اللہ کی شان دیکھیں کہ انہوں نے جب حدیث کی تلاوت کی تو انہوں نے پڑھا:

''مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ...''

یہاں پہنچ کر ان کی روح نکل گئی اور یہ پریکٹیکلی جنت میں داخل ہو گئے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

انہوں نے یہ حدیث مبارکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ساٹھ (۶۰) سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے نبی علیہ السلام سے علم سیکھا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر انسان ساٹھ سال کی عمر میں بھی ہو تو بھی وہ علم حاصل کر سکتا ہے، پریشانی والی بات کوئی نہیں، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابی بن گئے...... ہاں! انہوں نے نبی علیہ السلام سے دعا بھی کروائی تھی، آپ بھی دعا کروائیں اور عمر کے جس حصے میں بھی ہیں، اپنے آپ کو طالب علم سمجھتے ہوئے اپنے اساتذہ سے علم حاصل کریں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بھی اصل نام ''عبدالرحمٰن'' تھا، جب یہ کافر تھے تو ان کا نام عبد شمس تھا، حاکم نے اپنی مستدرک میں لکھا ہے:

''كَانَ اسْمِيْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ عَبْدُ شَمْسٍ'' [مستدرک الحاکم، حدیث: ٦١٤١]

''جاہلیت کے زمانے میں میرا نام عبد شمس تھا۔''

یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہوئے، آج آپ عبدالرحمٰن کا نام لیں تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کر رہا ہے۔ ان کی کنیت کیسے مشہور ہوئی؟ اس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں:

''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْنِيْ أَبَا هِرٍّ''

''هِر'' عربی میں کہتے ہیں بلے کو اور اس کی تانیث ''هِرَّة'' ہے اور اگر اس کی تصغیر کریں تو وہ هِرَّة کے بجائے ''هُرَيْرَة'' بن جائے گی، وہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلام مجھے اَبُو هِر کہتے تھے۔

''وَيَدْعُوْنِي النَّاسُ أَبَا هُرَيْرَةَ'' [مستدرک الحاکم، حدیث: ٦١٤٢]

''اور لوگوں نے مجھے ابو ہریرہ کہنا شروع کر دیا۔''

اس طرح ان کا یہ نام مشہور ہو گیا۔

حدیثِ مسلسل بالکوفیین:

طلبہ یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے جو استاد تھے، احمد بن اشکاب، وہ بھی کوفی تھے، پھر جو اُن کے استاد تھے، محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ، وہ بھی کوفی تھے، پھر جو اُن کے استاد تھے، عمارہ ابن قعقاع رحمۃ اللہ علیہ، وہ بھی کوفی تھے، پھر ان کے جو استاد تھے، ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ، وہ بھی کوفی تھے، لہٰذا اس حدیث کو سند کے اعتبار سے مُسَلْسَلًا بِالْكُوْفِيِّيْن کہتے ہیں۔ اسی لیے تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے اتنی مرتبہ کوفہ گیا کہ مجھے وہ تعداد ہی یاد نہیں کہ کتنی دفعہ کوفہ کے چکر لگائے۔

تشریحاتِ متن

اب حدیث مبارکہ کی طرف توجہ فرمائیں...... نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

كَلِمَتَانِ
"دو کلمے ایسے ہیں۔"

صرف ونحو میں ایک لفظ کو کلمہ کہتے ہیں، لیکن یہاں پر پورے فقرے کو کلمہ کہہ دیا، چنانچہ کہتے ہیں: کلمۂ شہادت، کلمۂ اخلاص۔ وہ پورا فقرہ ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے کلمے کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اصل میں اس کا معنی ہے:

"كَلَامَانِ" "دو کلام ایسے ہیں۔"

اس کے لیے لفظ استعمال کرلیا: كَلِمَتَانِ

حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ
"رحمٰن کو بڑے پیارے ہیں"

لفظ "رحمٰن" استعمال کرنے کی وجہ:

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے لفظ رحمٰن کو استعمال کیا گیا ہے، اس کی دو وجوہات ہیں:

ایک وجہ تو یہ کہ رحمٰن اس کو کہتے ہیں جو اپنوں کو بھی دے اور پرایوں کو بھی دے، جو مومن کو بھی دے کافر کو بھی دے، جو وفادار کو بھی دے اور غدار کو بھی دے۔ وہ رحمٰن جس کی رحمت اتنی وسیع ہوتی ہے کہ اپنے پرائے سب کو دیتا ہے۔ چنانچہ آج کافروں کو اولاد کون دیتا ہے؟ اللہ دیتا ہے۔ کافروں کو رزق کون دیتا ہے؟ اللہ دیتا ہے۔ تو اللہ مومنوں کو بھی دیتے ہیں کافروں کو بھی دیتے ہیں، ان کی صفت رحمٰن ہے: اپنوں کو بھی دینا،

پرایوں کو بھی دینا۔

اور دوسرا ''رحمٰن'' اس کو کہتے ہیں جو تھوڑے عمل پہ زیادہ بدلہ دینے والا ہو۔ یعنی کام تو چھوٹا ہو، لیکن مزدوری بہت زیادہ دینے والا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ گھر میں بجلی کا کام کرنے والا آیا اور اس نے ایک بلب کو ٹھیک کر دیا، لیکن مالک نے اس کو بیس، تیس ریال دینے کے بجائے پانچ سو ریال کا نوٹ پکڑا دیا۔ اب جس نے پانچ سو ریال کا نوٹ دے دیا، اس کے اندر رحمانیت کی صفت تھی کہ اس نے تھوڑی محنت پر اجر بہت زیادہ دے دیا۔

اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح تھوڑے عمل پہ زیادہ اجر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث مبارکہ ہے، عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ درود شریف پڑھے:

''جَزَى اللّٰهُ عَنَّا مُحَمَّدًا مَّا هُوَ اَهْلُهٗ''

یہ درود شریف اتنا چھوٹا سا ہے کہ یہ آدھے منٹ میں پڑھا جا سکتا ہے، اس کے پڑھنے پر پورا منٹ بھی نہیں لگتا، شاید پندرہ سیکنڈ میں ہی پڑھا جائے۔

فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص یہ درود شریف پڑھتا ہے۔

((اَتْعَبَ سَبْعِیْنَ کَاتِبًا اَلْفَ صَبَاحٍ)) [الترغیب والترہیب، حدیث: ۲۵۸۵]

''ستر فرشتے ایک ہزار دن تک اس کا اجر لکھتے رہتے ہیں۔''

اب بتائیں کہ دس پندرہ سیکنڈ کا فقرہ ہے اور اس کا اجر ایک ہزار دن تک لکھا جا رہا ہے اور ایک فرشتہ نہیں، بلکہ ستر فرشتے لکھ رہے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کتنا زیادہ اجر دینے والے ہیں۔

علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''القول البدیع'' میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ جو بندہ جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے اَسی (۸۰) مرتبہ یہ درود شریف پڑھے:

((اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الأُمِّیِّ وَعَلٰی آلِہٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا))

اللہ تعالیٰ اس کے اَسی (۸۰) سال کے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((عُمُرُ أُمَّتِي مِنْ سِتِّينَ سَنَةً إِلَى سَبْعِينَ سَنَةً)) [جامع ترمذی، حدیث:۲۳۳۱]

''میری اُمت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔''

یعنی ایسے بھی ہوگا کہ بچہ پیدا ہوگا اور پیدا ہوتے ہی مر جائے گا اور ایسا بھی ہوگا کہ سو سال کا ہو کر مرے گا، لیکن جب اوسط نکالیں گے تو اس امت کی عمریں ساٹھ ستر کے درمیان بنیں گی۔ اب جس کی عمر اَسی سال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی پوری زندگی کی بات ہو رہی ہے۔ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: جو اَسی مرتبہ پڑھے، اس کے اَسی سال کے گناہ معاف...... یعنی اَسی مرتبہ کے پڑھنے پر اللہ پوری زندگی کے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔

زبان پر آسان کلمات:

آگے فرمایا:

خَفِیْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ

''زبان کے اوپر بڑے آسان ہیں۔''

یعنی ان کو ادا کرنا آسان ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں، وہ حروفِ لین کہلاتے ہیں۔ زیادہ حروف وہ ہیں کہ آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں۔ بعض حروف کا ادا کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض کا ادا کرنا ثقیل ہوتا ہے، مشکل ہوتا ہے۔ اللہ کا لفظ بولنا بہت آسان ہے۔

طلبہ یاد رکھیں کہ حرکتیں تین ہوتی ہیں: فتحہ، کسرہ، ضمہ۔ زبر، زیر اور پیش۔ اب ان میں جو زیر اور پیش ہیں ان کا ادا کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جو زبر (فتحہ) ہے اس کا لفظ ادا کرنا آسان ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ حیران ہوں گے کہ بچہ جب بولنا سیکھتا ہے تو سب سے پہلے وہ ایسا لفظ بولتا ہے جو زبر سے شروع ہوتا ہے: اماں...... ابا...... اللہ۔ اس لیے کہ یہ اَخَفُّ الْحَرَکَاتُ ہے، سب سے زیادہ آسان حرکت ہے۔ تو بھئی! جب اسے ادا کرنا سب سے آسان ہے تو اماں، ابا کے بجائے بچے کو اللہ کا لفظ سکھانا چاہیے، تاکہ بچہ پہلی مرتبہ اللہ کا نام بولے اور اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کے ماں باپ کے پچھلے سب گناہوں کو معاف فرمادے۔

میزان پر بھاری کلمات:

تو یہ کلمات زبان سے ادا کرنے تو آسان ہیں، مگر......

ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ

”میزان کے اندر بڑے بھاری ہیں۔“

یعنی قیامت کے دن میزان کے اندر وہ بڑے وزنی ہوں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((اَلتَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ يَمْلَأُهُ)) [جامع ترمذی، حدیث: ۳۵۱۸]

”جو بندہ سبحان اللہ پڑھتا ہے تو اس کا آدھا میزان نیکیوں سے بھر جاتا ہے اور وہ اگر الحمدللہ بھی کہہ دے تو پورا میزان نیکیوں سے بھر جاتا ہے۔“

پھر آگے فرمایا:

تنزیہہ:

سبحان اللہ کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ ہر نقص سے، ہر بُرائی سے، ہر کجی سے، ہر کوتاہی سے پاک ہے۔ دیکھیں! کسی کی تعریف کرنے کے دو انداز ہوتے ہیں: ایک ہوتا ہے اس میں صفات کو ثابت کرنا۔ مثلاً کسی عورت کی تعریف کرنی ہے تو کہا جائے: بڑی تعلیم یافتہ ہے، بڑی خوبصورت ہے، خوش اخلاق ہے، اچھے خاندان کی ہے۔ یہ بھی اس کی تعریف کا ایک انداز ہے۔

اور تعریف کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ کہا جائے: غصے والی بھی نہیں ہے اور بدتمیز بھی نہیں ہے اور دل میں کدورت رکھنے والی بھی نہیں ہے۔ تو ان الفاظ سے بھی اس کی تعریف ہو رہی ہے کہ جاہل بھی نہیں، بدتمیز بھی نہیں، غصے والی بھی نہیں اور کام چور بھی نہیں، یہ بھی اس کی تعریف ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعریف کے بھی دو انداز ہیں: ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کریم ہیں، رحیم ہیں، رحمان ہیں، حنّان ہیں، منّان ہیں، یہ بھی اللہ کی تعریف ہے اور اللہ کو پسند ہے۔

اور ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کے بارے میں کہا جائے: ہمارا اللہ ہر عیب سے، ہر کوتاہی سے پاک ہے، بلند ہے، مبرّ ہ اور منزّ ہ ہے، اللہ کو یہ بات بھی بڑی پسند آتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنی تعریف خود کی ہے۔ اللہ اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ﴾

''پس اللہ پاک ہے، ہر کوتاہی سے، ہر عیب سے۔''

تعریف کے لائق فقط اللہ کی ذات:

وَبِحَمْدِهٖ

"اللہ تعالیٰ ہی کی سب تعریفیں ہیں۔"

اور سچی بات یہ ہے کہ تعریفیں سبھی فقط اللہ ہی کو ہیں، تعریف کے لائق فقط اللہ ہی کی ذات ہے۔ ہم جتنی تعریفیں کریں، جتنی تعریفیں کریں، ہم اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے کا حق ادا کر ہی نہیں سکتے۔ ہم کیا حق ادا کریں گے، اللہ کے پیارے حبیب ﷺ جو احمد ہیں، جن کا نام قیامت کے دن احمد ہوگا، احمد کا کیا معنیٰ؟ کہ انہوں نے اللہ کی اتنی حمد بیان کی کہ مخلوق میں سے کسی نے اللہ کی اتنی حمد بیان نہیں کی۔ تو

......جن کا نام احمد ہوگا

......جن کے ہاتھ میں قیامت کے دن لِوَاءُ الْحَمْد (حمد کا جھنڈا) ہوگا

......جن کو مقامِ محمود عطا ہوگا

......جن کا جنت میں گھر ہوگا، اس کا نام "بیت الحمد" ہوگا

......اوران کی امت کا نام قیامت کے دن "حمادون" ہوگا

......انہوں نے اللہ کی اتنی تعریفیں کیں کہ اور کوئی اتنی تعریفیں کر ہی نہیں سکتا

لیکن انہوں نے بھی ایک موقع پر کہہ دیا:

((لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ))

[سنن ابی داؤد، حدیث:۸۷۹]

"(اے اللہ!) میں آپ کی تعریفوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ (اے اللہ!) آپ ایسے ہیں جیسے آپ نے اپنی تعریفیں خود فرمائی ہیں۔"

اگر نبی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تعریف کا حق ادا نہ کر سکے تو ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں کہ

ہم اللہ کی تعریفوں کا احاطہ کر لیں؟ ہم اللہ کی تعریف کا حق ہی ادا نہیں کر سکتے۔ وہ بہت بلند ہے، جتنا ہم تعریفیں کریں، اس سے بھی بلند...... اس سے بھی بلند...... اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔

ہمارے مشائخ میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی حمد عجیب الفاظ میں بیان کی ہے، فرماتے ہیں:

''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے امکان کو وجوب کا آئینہ اور عدم کو وجود کا مظہر بنایا۔ وجوب اور وجود اگرچہ حق سبحانہٗ کی صفات میں سے ہیں، لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ ان سے بلند ہے، بلکہ وہ اسماء وصفات سے، شیون و اعتبارات سے، ظہور اور بطون سے، بُرود اور مکُون سے، تجلیات وظہورات سے، موصول اور مفصول سے، مشاہدات اور مکاشفات سے، محسوسات اور ماکولات سے، موہومات اور متخیلات سے بھی بلند ہے۔

وَهُوَ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ

کسی حمد کرنے والے کی حمد اس کی ذات تک نہیں پہنچ سکتی، بلکہ تمام تعریفوں کی نہایت اس کی عزت کے پردوں سے نیچے رہ جاتی ہے، اس ذات پاک نے اپنی تعریف آپ ہی کی ہے اور اپنی حمد کو آپ ہی بیان کیا ہے، پس وہ ذاتِ تعالیٰ آپ ہی حامد ہے اور آپ ہی محمود ہے۔''

اللہ تعالیٰ خود ہی حامد ہے اور خود ہی محمود ہے، کوئی اور اس کی تعریف کر ہی نہیں سکتا، وہ پروردگار اتنا بلند وبالا ہے۔

چنانچہ آپ غور کریں! ہم نماز کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی تعریف ہی تو کرتے ہیں:

''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا

اِلٰہَ غَیْرُکَ"

اللہ کی حمد کتنے اچھے الفاظ سے بیان کی گئی ہے۔

عظمتِ خداوندی:

آگے فرمایا:

سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ "اللہ تعالیٰ پاک ہیں ا رعظیم ہیں۔"

واقعی! عظمت اللہ ہی کو سجتی ہے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾﴾ [فاطر:۴۱]

ایک جگہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِہٖ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾

[الزمر:۶۷]

تو یہ دو کلمات اللہ کو بہت پسند ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

اس حدیث مبارکہ میں ان دو کلمات کی فضیلت بیان کی گئی ہے، آپ حضرات مرد ہیں یا دور بیٹھی خواتین ہیں، آپ بھی ان دونوں کلمات کو چند مرتبہ پڑھ لیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

حدیث کو آخر پر لانے کی وجہ؟

اب ایک آخری سوال طالب علم کے ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پاک کو آخری حدیث کے طور پر کیوں چنا؟ کوئی اور حدیث پاک بھی آخری حدیث کے طور پر بیان کر سکتے تھے، آخر اسی حدیث پاک کو کیوں چنا؟

محدثین نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں:

۞......فرماتے ہیں: قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرماتے ہیں:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ﴾ [الطور:۴۸]

''اور جب تم اُٹھتے ہو اس وقت اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیا کرو۔''

تو نبی علیہ السلام کو چونکہ حکم تھا اور نبی علیہ السلام ایسا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر سنت کی اتباع کا غلبہ تھا، لہٰذا جب کتاب لکھ کر فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا: میں اس آیت پر بھی عمل کر لوں، اُٹھنے سے پہلے میں اللہ کی تسبیح بیان کر لوں، اس لیے انہوں نے حدیثِ تسبیح کو لکھا اور پھر اپنے کام کو مکمل کیا۔

۞......بعض محدثین نے کہا: جب اللہ رب العزت کی مدد و نصرت آئی تو اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا:

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ [النصر:۳]

''تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت مانگو۔''

چونکہ نبی علیہ السلام کو تسبیح کا حکم ہوا، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب کو جب مکمل کیا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ کتاب مَیں اللہ کی مدد و نصرت کے بغیر مکمل نہیں کر سکتا تھا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا تھا کہ جب مدد و نصرت آئے تو تسبیح بیان

کریں، لہٰذا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آخری حدیث کے طور پر حدیثِ تسبیح کو پسند کیا، تاکہ اللہ کی تسبیح بیان ہوجائے اور اللہ کی حمد بیان ہوجائے۔

۞......ایک بات اور بھی ہے کہ یہ جو ''سبحان اللہ'' پڑھنا ہے، یہ انسان سے پریشانیوں اور مصیبتوں کو ٹال دیتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ جب طلبہ حدیث پڑھ کر اب اپنے گھروں کو واپس جائیں گے......کوئی وہاں پر تدریس کرے گا، کوئی خطابت کرے گا، کوئی امامت کرے گا، کوئی اپنا کام کاروبار کرے گا تو مختلف کاموں میں یہ مشغول ہوجائیں گے، پھر ان کو عوام کے ساتھ واسطہ پڑے گا۔ اور جب عوام کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے تو انسان کے اوپر مصیبتیں اور مشکلات آتی ہیں، زندگی میں پریشانیاں آتی ہیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ اگر کسی طالب علم کو کوئی پریشانی آئے تو وہ پھر عاملوں کے پاس نہ بھاگتا چلا جائے کہ جی! مجھے کیا کرنا ہے؟ بلکہ میں خود ان کو ایسا عمل بتا دیتا ہوں کہ اگر یہ عمل کرتے رہیں گے تو اللہ ان کو مصیبتوں کے منہ سے نکال لیں گے اور ان کو اللہ تعالیٰ مصیبتوں سے محفوظ فرمالیں گے۔

حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے، مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے، وہاں انہوں نے اللہ کی تسبیح بیان کی اور پڑھا:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾﴾ [الانبیاء:۸۷]

تو اللہ نے ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں۔ توجہ فرمائیں:

﴿فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿١٤٣﴾ لَلَبِثَ فِىْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤٤﴾﴾ [الصافات:۱۴۳،۱۴۴]

''چنانچہ اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو وہ اس دن تک اسی مچھلی

کے پیٹ میں رہتے جس دن مردوں کو زندہ کیا جائے گا۔"

یعنی مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کا کوئی اور طریقہ تھا ہی نہیں، ایک ہی طریقہ تھا کہ اللہ کی حمد بیان کرتے اور اللہ ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکال دیتے۔

اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ بعض اوقات یہ طلبہ حالات کی مچھلی کے پیٹ میں پھنس جائیں گے، قرضوں میں جکڑے جائیں گے اور ان کو نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی، یہ چاروں طرف بند محسوس کریں گے اور پھر یہ سوچیں گے کہ اب اس مچھلی کے پیٹ سے ہم کیسے باہر نکلیں؟ اگر یہ اللہ کی حمد اور تسبیح کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کے حالات کی مچھلی کے پیٹ سے، قرضے کی مچھلی کے پیٹ سے نکال دیں گے، اس تسبیح کی برکت کی وجہ سے۔ چنانچہ سبحان اللہ کے پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائشیں گھٹا دی جاتی ہیں۔

سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی:

"إِنَّ عُمَرَ جَلَدَ رَجُلًا يَوْمًا"

"عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن ایک بندے کو سزا میں دُرّے لگوائے۔"

جیسے پولیس مجرم کو جوتے مارتی ہے نا! ......تو اسی طرح کسی نے کوئی جرم کیا ہو گا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلاد کو کہا کہ اس کو ذرا دُرّے لگاؤ۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، وہ وہاں تشریف فرما تھے۔

"فَقَالَ الرَّجُلُ حِيْنَ وَقَعَ عَلَيْهِ السَّوْطُ"

"جب وہ دُرّہ اس کی کمر پر پڑا تو اس نے کہا: سبحان اللہ......"

یعنی اس زمانے کے مجرم بھی ایسے تھے کہ وہ ایسی حالت میں بھی اللہ کو یاد کرتے تھے، اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ کیسا خیر کا زمانہ تھا! جب اس بندے کو دُرّہ لگا تو اس نے

اُوئی نہیں کہا، بلکہ اس نے کہا: سبحان اللہ! جب اس نے کہا: سبحان اللہ!

''فَقَالَ عُمَرُ لِلْجَلَّادِ: دَعْهُ'' ''عمر رضی اللہ عنہ نے جلاد کو کہا: اس کو چھوڑ دے۔''

''فَضَحِكَ كَعْبٌ''

''تو کعب رضی اللہ عنہ ہنسنے لگ گئے، مسکرانے لگ گئے۔''

''فَقَالَ لَهُ: وَمَا يُضْحِكُكَ؟''

''ان سے پوچھا گیا: حضرت! آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟ کیا مسئلہ ہوا؟''

''قَالَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَخَفَّفَ مِنْهُ الْعَذَابَ''

''انہوں نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔
سبحان اللہ نے اس بندے کے عذاب کو کم کر دیا۔''

تو سبحان اللہ پڑھنے سے بندے کے اوپر جو آزمائشیں آتی ہیں، وہ ختم ہو جاتی ہیں، عذاب ٹل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مہربانی فرما دیتے ہیں۔

طلبہ کو اہم نصیحت:

لہٰذا جو طلبہ آج آخری حدیث کا سبق پڑھ رہے ہیں، یہ اب اپنے گھروں کو جائیں گے، یہ اس علم کی امانت کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے، ان کی خدمت میں ایک گزارش ہے کہ یہ جہاں بھی جائیں یہ علم کا رشتہ تازہ رکھیں، بحال رکھیں، اس سے کٹنے نہ پائیں۔ آج کے دور میں مصیبت یہ ہے کہ بعض طلبہ جاتے ہیں تو کوئی کاروبار میں لگ جاتا ہے، کوئی سکول کے اندر پڑھانے میں لگ جاتا ہے اور ان سے علم پڑھنے، پڑھانے کا سلسلہ چھوٹ جاتا ہے، یہ اس امانت کے ساتھ بہت زیادتی ہوگی یا دوسرے لفظوں میں

بددیانتی ہوگی کہ انسان اتنے سال اپنے اساتذہ سے علم حاصل کرے اور پھر بالکل اس سے اپنا پتہ ہی کاٹ لے۔

یہ رشتہ محبت کا قائم ہی رکھے
جو سو بار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

آپ اپنا کام کریں لیکن شام کے اوقات میں اپنے محلے کے بچوں کو پڑھائیں، خاندان کے بچوں کو پڑھائیں، نوجوانوں کو پڑھائیں، اپنے گھر کی عورتوں کو پڑھائیں، کوئی نہ کوئی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ لازماً جاری رہنا چاہیے، تاکہ علم کا رشتہ بحال رہے۔ جس کے علم کا رشتہ بحال رہے گا اس کو قیامت کے دن نبی علیہ السلام کی شفاعت بھی نصیب ہوگی۔

عمل کی اپنے اساس کیا ہے
بجز ندامت کے پاس کیا ہے
رہے سلامت تمہاری نسبت
مرا تو بس آسرا یہی ہے

عزیز طلبہ! ہمارے پاس تو اس نسبت کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور جو بندہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان احادیث کو پڑھے گا، پڑھائے گا پھر اس کو نبی علیہ السلام کی شفاعت بھی نصیب ہوگی۔

میزانِ عدل پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت:

ایک حدیثِ مبارکہ سن لیجیے، اس کو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

«إِنَّ لِآدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مَوْقِفًا فِي فَسَحٍ مِنَ الْعَرْشِ»

قیامت کے دن جب ساری مخلوق موجود ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس وقت آدم علیہ السلام کو بڑا لمبا قد عطا فرمائیں گے۔ وجہ کیا؟ کہ اولادِ آدم کے نامۂ اعمال کو تولا جائے گا...... اب مجمع زیادہ ہو تو درمیان میں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ پتا نہیں چلتا۔ لوگ دیکھنے کے لیے پھر کوٹھوں کے اوپر، گھروں کی چھتوں پہ چڑھ جاتے ہیں کہ ہم اوپر سے دیکھیں، ہو کیا رہا ہے؟...... تو اللہ تعالیٰ بھی آدم علیہ السلام کو قیامت کے دن اونچا قد عطا فرمائیں گے، جیسے کوئی کھجور کا درخت ہوتا ہے اور وہ دور کھڑے اپنی جگہ سے ہر بندے کو دیکھیں گے کہ یہ بندہ جنت جا رہا ہے اور یہ بندہ جہنم جا رہا ہے۔

«عَلَيْهِ ثَوْبَانِ أَخْضَرَانِ»

''انہوں نے دو سبز کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔''

جیسے ایک بندہ احرام کی دو چادروں میں لپٹ جاتا ہے تو آدم علیہ السلام بھی دو سبز کپڑوں میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔''

«كَأَنَّهُ نَخْلَةٌ سَحُوْقٌ»

''ایسے جیسے کوئی کھجور کا اونچا درخت ہوتا ہے۔''

آدم علیہ السلام یوں محسوس ہوں گے جیسے وہ کھجور کا درخت ہیں۔

«يَنْظُرُ إِلَى مَنْ يَنْطَلِقُ بِهِ مِنْ وَّلَدِهِ إِلَى الْجَنَّةِ وَ مَنْ يَنْطَلِقُ بِهِ إِلَى النَّارِ»

''وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ان کی اولاد میں سے کس کو جنت لے جایا جا رہا ہے اور کس کو جہنم لے جایا جا رہا ہے۔''

«فَبَيْنَا آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلٰى ذَالِكَ»
"فرمایا: آدم علیہ السلام اس حال میں ہوں گے۔"

«اِذْ يَنْظُرُ اِلٰى رَجُلٍ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْطَلِقُ بِهٖ اِلَى النَّارِ»
"جب وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے ایک بندے کو دیکھیں گے کہ اس کو آگ کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا۔"

«فَيُنَادِيْ آدَمُ: يَا اَحْمَدُ! يَا اَحْمَدُ!»
"آدم علیہ السلام آواز لگائیں گے: اے احمد! اے احمد!"
نبی علیہ السلام کا نامِ نامی اسمِ گرامی آخرت میں احمد ہوگا، دنیا میں محمد تھا......تو احمد کے نام سے پکاریں گے۔ چنانچہ جب وہ احمد! احمد! کا نام پکاریں گے۔

«فَيَقُوْلُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ: لَبَّيْكَ يَا اَبَا الْبَشَرِ!»
"نبی علیہ السلام فرمائیں گے: اے بشر کے والد! میں حاضر ہوں۔"

«فَيَقُوْلُ: هٰذَا رَجُلٌ مِنْ اُمَّتِكَ يَنْطَلِقُ بِهٖ اِلَى النَّارِ»
"آدم علیہ السلام کہیں گے: یہ آپ کی امت کا ایک بندہ ہے، اس کو آگ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔"
جب نبی علیہ السلام یہ سنیں گے کہ میرے ایک امتی کو جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

«فَاَشُدُّ الْمِئْزَرَ»
"میں اپنی چادر کو کس کے باندھ لوں گا۔"

عربوں میں اور ہماری زبان میں بھی کوئی بندہ کسی کام کے لیے ہمت کا قدم اُٹھائے تو کہتے ہیں کہ اپنی چادر کو باندھ لو، کمر کس لو۔ تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی وہی لفظ استعمال کیا کہ میں بھی اپنی چادر کو کس کر باندھ لوں گا۔

«وَ اَسْرَعُ فِیْ اَثَرِ الْمَلٰئِکَۃِ فَاَقُوْلُ: یَا رُسُلَ رَبِّیْ! قِفُوْا»

''اور جو ملائکہ میرے اُمتی کو لے کر جا رہے ہوں گے، میں ان کے پیچھے تیزی کے ساتھ چلوں گا اور کہوں گا: اے میرے رب کے نمائندو! رک جاؤ۔''

«فَیَقُوْلُوْنَ: نَحْنُ الْغِلَاظُ الشِّدَادُ»

''(وہ رکیں گے نہیں) بلکہ جواب میں کہیں گے: ہم تو بڑے سخت گیر ہیں۔''

«اَلَّذِیْنَ لَا نَعْصِی اللّٰہَ تَعَالٰی مَا اَمَرَنَا وَ نَفْعَلُ مَا نُؤْمَرُ»

''ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔''

تو فرشتے نبی علیہ السلام کے کہنے پر رکیں گے نہیں، بلکہ بندے کو لے کر جہنم کی طرف چلتے رہیں گے۔ جب وہ نہیں رکیں گے تو نبی علیہ السلام کے دل کو دکھ ہوگا کہ میں نے ان کو رکنے کے لیے کہا اور یہ میری بات ہی نہیں سن رہے۔

«فَاِذَا اَیِسَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ»

''جب نبی علیہ السلام ان سے مایوس ہو جائیں گے۔''

«قَبَضَ عَلٰی لِحْیَتِہٖ بِیَدِہِ الْیُسْرٰی وَ اسْتَقْبَلَ الْعَرْشَ بِوَجْہِہٖ»

''تو نبی علیہ السلام اپنے بائیں ہاتھ سے اپنی ریش مبارک کو پکڑیں گے اور عرش کی طرف رحم کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔''

اے اللہ! میرے اوپر رحم فرما دیجیے..... عربوں میں دستور تھا کہ جب کسی بندے

سے معافی مانگنی ہوتی تھی تو آدمی ان کے سامنے جا کے اپنی داڑھی کو بائیں ہاتھ سے پکڑتا تھا اور بڑی رحم کی نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا کہ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں، میرے اوپر رحم فرمالیں۔ چنانچہ نبی علیہ السلام قیامت کے دن ایسا ہی کریں گے۔ جب وہ بندہ جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا اور فرشتے رکیں گے بھی نہیں تو نبی علیہ السلام اپنی ریش مبارک کو بائیں ہاتھ سے پکڑیں گے اور عرش کی طرف دیکھیں گے اور کہیں گے:

((یَا رَبِّ قَدْ وَعَدْتَّنِیْ اَنْ لَّا تُخْزِیَنِیْ فِیْ اُمَّتِیْ))

''اے میرے پروردگار! آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے میری امت کے بارے میں رُسوا نہیں فرمائیں گے''

((فَیَأْتِی النِّدَاءُ مِنْ قِبَلِ الْعَرْشِ))

''تو عرش کے اوپر سے ندا آئے گی۔''

((اَطِیْعُوْا مُحَمَّدًا وَ رُدُّوْا هٰذَا الْعَبْدَ اِلَى الْمَقَامِ))

''اے فرشتو! میرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور ان کی بات کو مانو اور اس بندے کو واپس میزان کے پاس دوبارہ چھوڑ کے آؤ۔''

چنانچہ جب اللہ کی طرف سے حکم ہوگا تو فرشتے اس بندے کو میزانِ عدل کے پاس واپس لے کے آجائیں گے۔

((فَیُخْرِجُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِطَاقَةً بَیْضَاءَ كَالْاُنْمُلَةِ))

''پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزا نکالیں گے جو انگلی کے پورے کے برابر ہوگا۔''

((فَیُلْقِیْهَا فِیْ كَفَّةِ الْمِیْزَانِ الْیُمْنٰى))

''اور اس کو نیکیوں کے پلڑے کے اندر ڈال دیں گے۔''

((وَھُوَ یَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰہِ))

''اور ڈالتے ہوئے نبی علیہ السلام کہیں گے کہ اللہ کے نام سے میں یہ ڈال رہا ہوں۔''

((فَتَرْجَحُ الْحَسَنَاتُ عَلَی السَّیِّئَاتِ))

''تو نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور گناہوں کا پلڑا کم ہو جائے گا۔''

((فَیُنَادِیْ الْمُنَادِیْ سَعِدَ وَ سَعِدَ جَدُّہٗ وَ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ))

''یہ بندہ سعید ہو گیا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا۔''

((اِنْطَلِقُوْا بِہٖ اِلَی الْجَنَّۃِ))

''فرشتو! اب اس بندے کو جنت کی طرف لے کے جاؤ۔''

جب وہ فرشتے اس بندے کو جنت کی طرف لے کر جانے لگیں گے۔

((فَیَقُوْلُ یَا رُسُلَ رَبِّیْ! قِفُوْا حَتّٰی اَسْأَلَ ھٰذَا الْعَبْدَ الْکَرِیْمَ عَلٰی رَبِّہٖ))

''وہ بندہ کہے گا: اے میرے رب کے نمائندو! ذرا رک جاؤ کہ میں اس کریم بندے سے پوچھوں۔''

((فَیَقُوْلُ بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ!))

''پھر وہ بندہ کہے گا: آپ پر میرے ماں باپ قربان!''

((مَا اَحْسَنَ وَجْھَكَ وَ اَحْسَنَ خُلُقَكَ))

''آپ کا چہرہ کتنا خوبصورت ہے! اور آپ کے اخلاق کتنے اچھے ہیں!''

((مَنْ اَنْتَ؟)) ''آپ ہیں کون؟''

«فَقَدْ اَقَلْتَنِیْ عَثْرَتِیْ وَ رَحِمْتَ عَبْرَتِیْ»
”آپ نے میرے بوجھ کو کم کر دیا اور آپ نے میرے اوپر سے عذاب کو ٹال دیا۔“

«فَيَقُوْلُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ اَنَا نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ»
”نبی علیہ السلام فرمائیں گے: میں آپ کا نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں۔“

اللہ کرے کہ وہ بندے قیامت کے دن ہم ہی ہوں اور اللہ کے حبیب ہماری شفاعت فرمادیں اور ان کی شفاعت کے صدقے اللہ تعالیٰ ہمیں بھی جنت عطا فرمادے۔ (آمین)

«وَهٰذِهٖ صَلَاتُكَ الَّتِيْ كُنْتَ تُصَلِّيْ عَلَيَّ» [تفسیر روح المعانی:۸/ ۸۳]
”اور یہ تیرا درود شریف ہے، جو تو میرے اوپر پڑھا کرتا تھا۔“

یہ میں نے آپ کے نامۂ اعمال میں ڈالا اور اس کی وجہ سے اللہ نے آپ کی بخشش فرمادی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ساری زندگی اس علم کا خادم بن کر رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ان طلبہ کو اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے اور ان کے والدین کو اللہ تعالیٰ خوشیاں عطا فرمائے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾
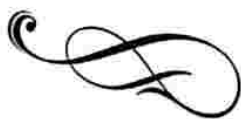
ذکر کے اثرات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۱، ۴۲)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

یاد کے دو طریقے:

قرآن مجید میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:
﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب:۴۱)
''اے ایمان والو! اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔''

یاد کرنے کے دو طریقے ہیں:
......ایک ہوتا ہے زبان سے یاد کرنا، کسی کے تذکرے کرنا۔
......اور ایک ہوتا ہے کسی کو دل میں یاد کرنا۔

دل میں یاد کرنا زبان سے یاد کرنے سے ستر گنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زبان سے بھی یاد کریں، دل سے بھی یاد کریں اور ہر وقت یاد کریں۔

محبت ذکر پر مجبور کرتی ہے:

یہ نکتہ ذہن میں رکھیں کہ محبت انسان کو ذکر پر مجبور کر دیتی ہے۔ آپ غور کریں! ماں اپنے بیٹے کا تذکرہ ایک ایک گھنٹہ کرتی رہتی ہے۔ میرا بیٹا دودھ کو ددھو کہتا ہے...... ایسے کھیلتا ہے...... ایسے جاتا ہے...... ایسے آتا ہے۔ جو بیوی اپنے خاوند سے خوش ہوتی ہے، وہ بھی ایک ایک گھنٹہ اس کی تعریفیں کرتی رہتی ہے۔ تو جہاں محبت ہو وہاں انسان کا دل مجبور کرتا ہے، تذکرہ کرنے کو۔ اسی طرح جب مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہوتی ہے تو وہ بے اختیار اپنے رب کے تذکرے کرتا ہے، اس کو یاد کرتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو جتنا یاد کریں، اتنا کم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کثرتِ ذکر کا حکم دیا کہ اے ایمان والو! اپنے رب کو کثرت سے یاد کرو۔

ذکر کا مقصود:

اب یہاں پر ایک نکتہ سمجھنے والا ہے کہ ذکر کا مقصود کیا ہے؟ ذکر کا مقصود کوئی عدد پورا کرنا نہیں ہے کہ ہم سو دفعہ یہ پڑھ لیں...... پانچ سو دفعہ یہ پڑھ لیں...... ہزار دفعہ یہ پڑھ لیں۔ ذکر کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کا اتنا تذکرہ کریں کہ اس ذکر کا اثر ہمارے جسم کے اعضا میں ظاہر ہو جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو انسان جتنا کسی کو یاد کرے گا، اس کے اتنے اثرات اس کے دل دماغ میں ہوں گے، اس کے جسم کے اعضا میں ہوں گے۔ انسان جب اپنے رب کی فرمانبرداری کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ حالتِ ذکر میں ہوتا ہے، اگرچہ اپنی زبان سے وہ کچھ بھی نہ پڑھ رہا ہو۔ ایک تفسیر میں لکھا ہے:

((لَيْسَ فَضْلُ الذِّكْرِ مُنْحَصِرًا فِي التَّهْلِيْلِ وَالتَّسْبِيْحِ وَالتَّكْبِيْرِ وَالدُّعَاءِ بَلْ كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ فِيْ عَمَلٍ فَهُوَ ذَاكِرٌ)) [تفسیر حقی: ۴/۳۶۶]

''ذکر کی فضیلت صرف کلمہ (لا الہ الا اللہ) تسبیح (سبحان اللہ) تکبیر (اللہ اکبر) اور دعا میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ شخص جو کسی بھی کام میں اللہ کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے، اس حال میں وہ ذاکر شمار ہوتا ہے۔''

یعنی اگر ہم گناہ نہ کر رہے ہوں، نیکی کر رہے ہوں تو نیکی کرنے کے دوران ہم ذاکر ہی کہے جائیں گے، گو کہ ہماری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل رہا ہو۔

افضل ذکر کیا ہے؟

اب افضل ذکر کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اَفْضَلُ الذِّكْرِ ذِكْرُ اللّٰهِ اِنَّمَا حَرَّمَ اللّٰهِ''

افضل ذکر یہ ہے کہ جب تمہارے سامنے گناہ کا موقع آئے تو تمہیں اس وقت خدا یاد آجائے اور تم گناہ سے رک جاؤ، یہ سب سے بہتر ذکر ہے۔ اب ایک بندہ کہے کہ میں بڑا ذاکر ہوں، بڑا اللہ کو یاد کرتا ہوں، لیکن جب گناہ کا موقع آئے تو اسے اللہ یاد ہی نہ ہو اور وہ گناہ کا آرام سے ارتکاب کرلے تو اسے کون ذاکر کہے گا؟ تو ذاکر وہ ہوتا ہے جس کے سامنے گناہ کا موقع پیش آئے اور اس وقت اس کو اپنا رب یاد آجائے اور اللہ تعالیٰ کی وجہ سے وہ گناہ سے بچ جائے۔

ذکر کے اثرات اعضائے جسمانی پر:

ہمارے مشائخ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے کھول کھول کر

ایک ایک چیز کو بیان کر دیا ہے۔ جو بندہ صحیح معنوں میں ذاکر ہوتا ہے، اس کے اعضا میں اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ آج کی مجلس میں انہی اثرات کے بارے میں بات کرنی ہے کہ جو بندہ ذاکر ہوتا ہے، اس کے جسم میں کس عضو میں کون سا اثر ہوتا ہے؟

زبان پر اللہ کی ثناء ہونا

پہلی بات یہ ہے کہ جو ذاکر انسان ہوتا ہے اس کی زبان پر ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا رہتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی تعریفیں ہی کرتا رہتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے رب کی اتنی تعریف کروں، اتنی تعریف کروں کہ کر کر کے تھک جاؤں۔ شاعر نے کہا:

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
ورنہ کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

اب بندے کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں۔ انسان جہاں جاتا ہے، اپنے رب کے تذکرے چھیڑ دیتا ہے، اپنے رب کی باتیں چھیڑ دیتا ہے، اس کی زندگی کا مقصد یہی بن جاتا ہے۔

ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے

تو زبان پر اللہ تعالیٰ کے تذکرے ہوں، انسان اللہ تعالیٰ کی تعریفیں کر کر کے تھکے نہیں۔ حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میں اے خدا دم بھروں گا تیرا بدن میں جب تک کہ جاں رہے گی
پڑھوں گا ہر وقت کلمہ تیرا، دہن میں جب تک زباں رہے گی
کوئی رہے گا نہ ذکر لب پر، فقط تری داستاں رہے گی
نہ شکوۂ دوستاں رہے گا، نہ غیبتِ دشمناں رہے گی

تو انسان کی زبان اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں ہر وقت مصروف رہے۔ حدیث مبارکہ میں بھی ہے:

((أَنْ تَمُوتَ وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ)) [صحیح ابن حبان، حدیث:۸۱۸]

''سب سے زیادہ پسندیدہ عمل یہ ہے کہ موت کے وقت تیری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو۔''

آنکھوں میں حیا ہونا

دوسری نشانی یہ ہوتی ہے کہ جس بندے کے اندر ذکر اثر کر جاتا ہے، اس کی آنکھوں میں حیا ہوتی ہے۔ حیا ایک نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرما دیتے ہیں، وہ بندہ نیکی، تقویٰ اور پاک دامنی کی زندگی گزارتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ)) [صحیح بخاری، حدیث:۹]

''حیا ایمان کا شعبہ ہے۔''

اور حیا میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ ایک جگہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ)) [صحیح بخاری، حدیث:۳۴۸۳]

''(اگلی) نبوت کے کلمات میں سے جو لوگوں نے پایا ہے یہ جملہ بھی ہے کہ جب تجھ میں حیا نہ رہے تو جو چاہے کر ڈال۔''

بے حیا بندے کو کیا، وہ جو مرضی کرے۔ تو حیا اللہ کی بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حیا والی نعمت عطا فرمائے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرم گین تھے۔ [صحیح بخاری، حدیث:۳۵۶۲]

ہمارے آقا ﷺ کی آنکھیں ایسی باحیا آنکھیں تھیں۔

یہ حیا کی صفت اللہ کو بہت پسند ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی کا تذکرہ کیا ہے جو شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ان کو بلانے کے لیے آئی تھی، مگر جب وہ آئی تو اتنی حیا سے چلتی ہوئی آئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اپنے کلام کا حصہ بنالیا۔ فرمایا:

﴿تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَاءٍ﴾ [القصص:۲۵]

''ان کے پاس شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی۔''

وہ کیسی خوش نصیب بچی ہوگی کہ جس کے حیا کو رب نے پسند کیا اور اس کو اپنے کلام کا ہمیشہ کے لیے حصہ بنالیا۔ اللہ اکبر کبیرا...... سبحان اللہ!!!

سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بہت باحیا تھیں۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت کی تمام عورتوں کی سردار بنایا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے یہ حیا والی نعمت مانگنی چاہیے۔

غیر محسوس لباس:

آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ حیا ایک نہ دکھائی دینے والا لباس ہوتا ہے۔ جیسے انسان نے کوئی ایسی چیز پہنی ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی۔

ہمیں اس کا تجربہ اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ ہم نے عمرہ کیا اور جلدی سے ہوٹل میں آئے کہ غسل کریں، کپڑے بدلیں، فجر میں وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ جب میں غسل خانے میں نہانے کے لیے گیا تو وہاں صابن پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے پانی کھولا، جسم گیلا ہوگیا تو میں نے صابن اپنے جسم پہ لگانا چاہا، مگر وہ جھاگ ہی نہیں بن رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی پتھر ہے جو میں اپنے جسم کے اوپر مل رہا ہوں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ اتنا

معیاری ہوٹل ہے اور اس میں انہوں نے اس قسم کا گھٹیا کوالٹی کا صابن رکھا ہوا ہے تو میں نے اپنی آنکھوں کو پھر ذرا پانی سے صاف کیا۔ اور جب غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ اس صابن کی ٹکیہ کے اوپر انہوں نے ایک ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک چڑھائی ہوئی تھی، جو دیکھنے میں نظر نہیں آتی تھی، لیکن چڑھی ہوئی تھی۔ اب میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس پلاسٹک کو پھاڑا، جب صابن نکلا تو اس کو استعمال کرنا آسان ہو گیا۔

اس دن مجھے بات سمجھ میں آئی کہ جس طرح ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک اس کو کور کر لیتی ہے کہ بندہ اس صابن کو استعمال ہی نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح حیا بھی ایک نعمت ہے، جس عورت کو حیا کا یہ لباس مل جائے، غیر محرم مرد اس عورت تک Approach (پہنچ) پا ہی نہیں سکتا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو کسی بچی کو حیا نصیب ہو جائے۔

ہاتھوں میں عطا ہونا

ایسے بندے کے جو ہاتھ ہیں وہ عطا کی صفت رکھتے ہیں۔ یعنی زبان سے ثنا ہو...... آنکھوں میں حیا ہو اور ہاتھوں میں عطا ہو۔ عطا سے کیا مراد؟ کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عادت ہو۔ بعض لوگ مالدار ہوتے ہیں اور بعض لوگ مال کے چوکیدار ہوتے ہیں، وہ بے چارے گن گن کر رکھتے ہیں کہ ہمارے اکاؤنٹ میں اتنا اتنا پیسہ ہے، اب میرے بٹوے میں اتنا ہے، مگر ان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بندے کو ایسا دل عطا فرمائے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والا ہو۔ قبیلہ طے کا ایک سخی بندہ گزرا ہے، اس کا نام تھا حاتم طائی۔ بڑا سخی انسان تھا۔ اس کا تذکرہ نبی علیہ السلام کے سامنے ہوا تو آپ نے اس کو پسند کیا۔ سخاوت کی صفت نبی علیہ السلام کو پسند تھی۔

حاتم طائی کا قصہ مشہور ہے۔ ایک فقیر نے اس سے پانچ دینار مانگے، اس نے اپنے نوکر کو کہا کہ اس کو پانچ سو دینار دے دو۔ نوکر بڑا حیران ہوا کہ مانگنے والا پانچ دینار مانگ رہا ہے اور اس نے کہا کہ پانچ سو دینار دے دو۔ اس نے حاتم طائی سے پوچھا: کیا آپ کے پاس مال فالتو ہو گیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، فالتو تو نہیں ہے۔ اس نے کہا: پھر پانچ مانگنے والے کو آپ نے پانچ سو کیوں دیے؟ تو حاتم طائی نے جواب دیا: مانگنے والے نے اپنی اوقات کے مطابق مانگا تھا، دینے والے نے اپنے مرتبے کے مطابق عطا کیا۔ تو یہ سخاوت ہوتی ہے کہ انسان دل کھول کر اللہ کے دین کے لیے خرچ کرتا ہے۔

یہ صفت تمام صحابیات رضی اللہ عنہن کے اندر اور اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کے اندر بہت زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایک لاکھ درہم ملے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھیجے تھے۔ انہوں نے اسی وقت مدینہ کی بیواؤں اور یتیم بچوں کو بلایا اور سارے کے سارے درہم ان بیواؤں اور بچوں میں تقسیم کر دیے۔ پھر ایک باندی آ کر کہنے لگی: جی! آپ کا روزہ ہے اور افطاری کے لیے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے، مجھے پیسے دے دیں، میں افطاری کا انتظام کر لوں۔ فرمایا: میں نے تو سب کچھ تقسیم کر دیا، اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ سبحان اللہ! کیسی عجیب بات ہے کہ آدمی روزے کے ساتھ ہو اور وہ ایک لاکھ درہم خرچ کر دے اور اس کو یہ بھی یاد نہ آئے کہ میری افطاری کے لیے کچھ بچا ہے یا نہیں۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُمّ المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی طرف تیس یا پچاس ہزار درہم بھیجے۔ جیسے ہی ان کو ملے، انہوں نے اسی وقت اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیے اور صدقہ کرنے کے بعد اب دو رکعت نفل پڑھ کر دعا مانگی: اے اللہ! امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو توفیق ہی نہ دے کہ وہ مجھے پیسے بھیجا کریں۔ اللہ اکبر کبیرا! یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کی حقیقت کو سمجھا تھا۔ اپنا سارا کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتے تھے۔

معمولی صدقہ سے گناہوں کا کفارہ:

یہ جو انسان اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، دین کے لیے، مدارس کے لیے، مسجد کے لیے یا غریبوں کے لیے، اللہ کے ہاں اس کا بڑا رتبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا ایک واقعہ توجہ کے ساتھ سنیے۔

ایک عبادت گزار تھا۔ اس نے ساٹھ سال تک اپنے کمرے میں اللہ کی عبادت کی۔ اللہ اکبر کبیرا!...... ساٹھ سال عبادت میں گزار دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے...... ساٹھ سال کے بعد ایک دن ایسا آیا کہ باہر خوب بارش ہوئی اور ٹھنڈی ہوا چلی تو اس عبادت گزار بندے کا دل چاہا کہ باہر پانی کے چشمے ہیں اور بارش ہوئی ہے اور موسم بہت اچھا ہے تو میں ذرا باہر نکل کر دیکھوں تو سہی قدرتی مناظر کو۔ وہ باہر نکلا۔ اللہ کی شان کہ شیطان اس کی تاک میں تھا۔ ایک بکریاں چرانے والی عورت کہیں سے آ گئی اور اس عورت نے آ کر اس عبادت گزار سے ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ اس نے اس کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ حتیٰ کہ وہ مرد اس عورت کے ساتھ بدکاری کا مرتکب ہو گیا۔ اب جب وہ بدکاری کا مرتکب ہوا تو اس نے سوچا کہ میں جلدی سے غسل کروں اور اللہ سے نفل پڑھ کر معافی مانگوں۔ وہ غسل کرنے کے لیے چشمے پر چلا گیا، جب اس نے کپڑے اتارے اور چشمے کے پانی کے اندر اُتر گیا، اتنے میں ایک سائل آیا اور اس نے اس کو کہا کہ بھئی! مجھے کچھ اللہ کے نام پر دے دو، میں بھوکا ہوں۔ اس عابد نے کہا کہ میرے جبے کی جیب میں تھوڑی سی رقم ہے یا کچھ کھانے کی چیز ہے وہ لے لو، اس بندے نے وہ چیز لی اور چلا گیا۔ اب یہ بندہ جب غسل کر رہا تھا تو اس غسل کے دوران ہی اس کی وفات ہو گئی۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو کہا کہ اس کی نیکیوں اور بُرائیوں

کوتولو۔ چنانچہ فرشتوں نے جب اس کی نیکی اور بُرائی کوتولا تو اس کی ساٹھ سال کی عبادت ہلکی نکلی، ایک مرتبہ کا زنا بھاری نکلا۔ یعنی ایک مرتبہ کا زنا اتنا بڑا گناہ تھا کہ ساٹھ سال کی عبادت اس کے مقابل میں نہ رہی۔ فرشتوں نے کہا: جی! اس کے تو گناہ زیادہ ہیں، نیکیاں تھوڑی ہیں۔ پھر ایک فرشتے نے کہا: اس نے مرتے مرتے کچھ صدقہ کیا تھا، اس کو بھی تولو۔ چنانچہ وہ جو صدقہ کیا تھا، اس کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں ڈالا تو وہ اتنا بھاری تھا کہ نیکیوں کا پلڑا جھک گیا اور اس بندے کو اللہ نے جنت عطا فرمادی۔

[صحیح ابن حبان، حدیث:۳۷۸]

اللہ کو قرض دیں:

تو دیکھیں یہ ہوتا ہے کسی غریب پر، فقیر پر، ضرورت مند پر خرچ کرنے کا فائدہ۔ یہ مدارس میں جو قرآن پڑھنے والے طلبہ اور طالبات ہیں ان پر خرچ کرنا، مساجد پر خرچ کرنا، دین کے لیے خرچ کرنا، اللہ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرة:۲۴۵]

''کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے؟''

واہ میرے مولا! آپ کی شان بھی کتنی بڑی ہے! بندے کو دیتے بھی آپ خود ہیں، ہمیں اور تو کہیں سے رزق نہیں ملتا، دیتے بھی آپ خود ہیں اور جب رزق دے دیتے ہیں تو پھر فرماتے ہیں کہ اگر تم میرے راستہ میں خرچ کرو گے تو یہ میرے اوپر قرض حسنہ ہوگا۔ اللہ اکبر کبیرا۔ اللہ تعالیٰ کتنے قدردان ہیں! کتنے مہربان ہیں!

قلب میں خوف ورجا ہونا

اس کے قلب میں خوف اور رجا ہوتی ہے۔ خوف کا مطلب ہے: اللہ کا ڈر۔ رجا کا

مطلب ہے: اللہ سے رحمت کی امید۔ قلب کے اندر یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ جب وہ اللہ کی رحمت پہ نظر دوڑاتا ہے تو اس کے دل میں اُمید لگ جاتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور جب وہ اپنی حالت کو دیکھتا ہے تو اسے ڈر لگ جاتا ہے کہ اوہ! میرے اتنے گناہ ہیں! میں کیسے نجات پاؤں گا۔ تو خوف اور رجا دونوں کا ہونا یہ مومن کے لیے ضروری ہے۔ انسان پھر نیکی کے اوپر چلتا رہتا ہے، دوڑ دوڑ کر نیکیاں کرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے۔

نفس کی مثال گدھے کے مانند:

اس کی مثال ایسے سمجھیں کہ جیسے ایک گدھا ہے، اس نے اس پر بوجھ لادا ہوا ہے، اب بوجھ کی وجہ سے چلتا نہیں تو گدھے کا مالک اسے آگے سے چارا دکھاتا ہے تاکہ اس کو طمع ہو کہ آگے بڑھوں اور چارا کھاؤں۔ اور پیچھے سے اس کو ڈنڈا بھی لگاتا ہے کہ یہ ڈنڈے کے خوف سے آگے چلے۔ تو جس طرح گدھے کو آگے سے چارا دکھاتے ہیں کہ اس کی طمع میں یہ آگے بڑھے اور پیچھے سے ڈنڈا لگاتے ہیں کہ اس کے خوف سے یہ آگے بڑھے، اسی طرح انسان کے نفس کی مثال بھی گدھے کے مانند ہے۔ اس کو امید دکھانی چاہیے تاکہ یہ آگے بڑھے اور پیچھے سے اللہ کے خوف سے ڈنڈا لگانا چاہیے، تاکہ یہ گناہوں سے بچے۔

خوف اور امید کے مواقع:

مومن کے دل میں خوف بھی ہو اور امید بھی ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی تفصیل لکھی ہے کہ کب خوف ہونا چاہیے؟ کب اُمید ہونی چاہیے؟ وہ فرماتے ہیں کہ جوانی میں اللہ کا خوف غالب ہونا چاہیے اور بڑھاپے میں انسان کو اللہ سے اُمید غالب

ہونی چاہے۔ صحت کی حالت میں بندے پر اللہ کا خوف غالب ہونا چاہیے اور بیماری کی حالت میں اللہ کی اُمید غالب ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی خوف اور رجا یہ دونوں نعمتیں عطا فرما دے۔

دماغ میں تسلیم ورضا ہونا

انسان کا جو دماغ ہے وہ تسلیم اور رضا سے بھرا ہونا چاہیے۔ تسلیم و رضا کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ کے ہر کام سے بندہ خوش ہو، ہمیں اس کی حکمت سمجھ آئے یا نہ آئے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ انسان کی سوچ چھوٹی ہوتی ہے، عقل چھوٹی ہوتی ہے تو انسان اس کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتا اور اعتراض کرنا شروع کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر: ہم نے یہ اجتماع کرنا تھا تو ہم نے ایک دن پہلے ٹینٹ لگوا لیے۔ اب جس دن مہمانوں نے آنا تھا، آندھی بھی آگئی، بارش بھی ہوگئی، تو مہمان بڑے Upset (آزردہ) ہوئے، ہم نے مہمانوں کے بھی Comments (تبصرے) سنے۔ کسی نے کہا: انتظام ٹھیک نہیں ہوا، بیٹھنے کی جگہ نہ رہی، لیٹنے کی جگہ نہ رہی، عبادت کا پروگرام بنایا تھا وہ ٹھیک نہ رہا۔ جو خدمت والی خواتین تھیں وہ بھی پریشان کہ ہم نے اپنی طرف سے تو اتنے انتظام کی کوشش کی تھی، عین موقع پر اللہ تعالیٰ نے سارے انتظام کو آگے پیچھے کر دیا۔ میں ان سب کی باتیں فون پر سنتا رہا اور دل میں مسکراتا رہا کہ واہ میرے مولا! آپ کتنے بڑے ہیں! حقیقت یہ تھی کہ ایک دن پہلے گھر کی عورتیں مجھے کہہ رہی تھیں کہ عورتیں تو بہت زیادہ آئیں گی لیکن گرمی بھی بہت ہے اور یہاں پر مچھر بھی بہت ہیں۔ کیونکہ بند جگہ ہے اور واقعی یہاں پر مچھروں کے لشکر تھے، پانچ دس ہزار مچھروں کا ایک جھنڈ آتا تھا اور جاتا تھا تو پھر دوسرا جھنڈ آجاتا تھا۔ اب ہمیں ڈر یہ تھا کہ

عورتوں کے ساتھ تو بچے بھی ہوں گے تو مچھروں نے اگر بچوں کو کاٹنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟ اللہ نے مہربانی کی کہ اس نے ہوا چلا دی اور ہوا نے مچھروں کے لشکروں کو یہاں سے بھگا دیا۔ اور اللہ نے پھر بارش کر کے جو موسم کی گرمی تھی اس کو بھی کم کر دیا۔ چنانچہ پہلے دنوں میں گرمی بہت زیادہ تھی آج اس کی نسبت گرمی کم تھی۔ تو دیکھیں! اس میں اللہ کی حکمت تھی اور ہمارے لیے بہتری تھی۔ ہم تو سپرے کروا کروا کر تھک گئے تھے کہ مچھر چلے جائیں اور مچھر جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔

مچھر کی شکایت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں:

ایک مرتبہ ایک مچھر نے سلیمان علیہ السلام کے دربار میں شکایت کی۔ کہنے لگا: جی! میری شکایت یہ ہے کہ میں بڑی مشکل سے کسی بندے کو ڈھونڈتا ہوں کہ میں اس کے جسم پر بیٹھ کر اس کا خون چوسوں، لیکن یہ جو ہوا ہے، یہ آتی ہے اور مجھے بھگا کر لے جاتی ہے اور یہ میرا کام خراب کر دیتی ہے۔ میں آپ کے دربار میں ہوا کے خلاف مقدمہ دائر کرتا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اچھا! میں ہوا کو بلاتا ہوں۔ اب جب انہوں نے ہوا کو بلایا تو مچھر وہاں سے بھاگ گیا کیونکہ وہ تو ہوا میں رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر جب ہوا چلی گئی تو مچھر پھر آ گیا، او جی! میں ہوا کی شکایت لگانے آیا ہوں۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: دیکھو! جب تک آپ اور جس پر آپ الزام لگا رہے ہیں دونوں موجود نہیں ہوں گے، میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مچھر کہنے لگا: ہوا کی موجودگی میں تو پھر میں آپ کے سامنے نہیں آ سکتا، انہوں نے کہا: جاؤ! تمہارا مقدمہ خارج کیا جاتا ہے۔ تو اللہ نے ہوا کو ایسا بنایا کہ وہ ہزاروں لاکھوں مچھروں کو بھگا دیتی ہے، ایک جھونکا آتا ہے اور مچھر چلے جاتے ہیں۔

اللہ کے ہر کام میں حکمت ہے:

دیکھو! اللہ کے کام میں حکمت تھی، ہمیں نہیں پتا تو نہ سہی۔ مگر انسان کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مالک کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔

''فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُوْا عَنِ الْحِكْمَةِ''

''جو دانا کا کام ہوتا ہے وہ دانائی سے خالی نہیں ہوتا۔''

ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کے ہر کام میں راضی رہنا سیکھیں۔ ہر چیز میں جو بھی ہو رہا ہے، ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے، اس میں حکمت ہے، اس میں بہتری ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میرے لیے یہی عزت کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے، اور میرے لیے یہی فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔''

ہماری اس سے بڑی عزت کیا ہوسکتی ہے کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور ہم اس کے بندے ہیں۔ سبحان اللہ!

راضی برضا بزرگ:

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کے بیٹے کی شادی تھی۔ باہر بارات جانے کے لیے تیار تھی اور وہ اپنے گھر میں کوئی چیز تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ بیوی نے دیکھا کہ بچے کی شادی ہے، بارات رخصت ہو رہی ہے اور باپ گھر میں ہے۔ اس نے آ کر پوچھا: آپ کیا تلاش کرتے پھر رہے ہیں؟ مجھے بتائیں میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔ وہ کہنے لگے: میں کفن تلاش کر رہا ہوں۔ بیوی بڑی حیران ہوئی کہ بیٹے کی بارات جا رہی ہے اور آپ کفن ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے: ہاں! مجھے الہام ہوا ہے کہ

میرے جس بیٹے کی بارات ہے اس کی ابھی موت آجانی ہے، تو میں نے کہا کہ میں اس کے لیے کفن ہی نکال کر رکھ لوں۔ میاں بیوی ابھی یہ بات کر رہے تھے کہ ایک بچہ باہر سے دوڑتا ہوا آیا کہ جب نوجوان گھوڑے کے اوپر سوار ہونے لگا تو اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سر کے بل نیچے گرا اور اس کی وفات ہوگئی۔ اب ایسے بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں کہ اپنے بیٹے کی وفات کی خبر الہام کے ذریعے ملی اور وہ کفن ڈھونڈ رہے ہیں کہ اچھا میرے مالک کو ایسے ہی منظور ہے تو میں اس کا کفن تلاش کر لیتا ہوں۔

ہر حال میں اللہ سے راضی:

ہم اپنے رب سے ہر حال میں راضی رہنا سیکھیں۔ ہم غور کریں تو ہماری زندگی میں غم تھوڑے ہیں، خوشیاں زیادہ ہیں...... بیماری تھوڑی ہے، صحت زیادہ ہے...... نقصان تھوڑا ہے، نفع زیادہ ہے...... شاعر نے کہا:

> لطفِ سجن دم بدم قہرِ سجن گاہ گاہ
> ایں بھی سجن واہ واہ ، اوں بھی سجن واہ واہ

''میرے محبوب کا لطف و کرم تو ہر وقت ہے اور اس کی ناراضگی کبھی کبھی، اے میرے سجن! میں ایسے بھی آپ سے راضی ہوں، میں ویسے بھی آپ سے راضی ہوں۔''

آپ مجھے جس حال میں رکھیں میں ہر حال میں راضی ہوں۔ تو انسان کے دماغ کے اندر تسلیم اور رضا والی صفت ہونی چاہیے۔

کیسے پتا چلے کہ اللہ ہم سے راضی ہے؟

ایک مرتبہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: ہمیں کیسے پتا چلے کہ اللہ

تعالیٰ ہم سے راضی ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں کوہِ طور پر جاؤں گا اور یہ بات اللہ سے پوچھوں گا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے تو اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: لوگ یہ پوچھتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے پیارے موسیٰ! اس بات کا پتا کرنا تو بہت آسان ہے کہ میں راضی ہوں یا ناراض ہوں۔ پوچھا: اے اللہ! کیسے؟ فرمایا: ان بندوں سے کہو کہ یہ اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھیں، اگر یہ مجھ سے راضی ہیں تو میں ان سے راضی ہوں، اگر یہ مجھ سے خفا ہیں تو میں ان سے خفا ہوں۔ جو بندہ خفا ہوتا ہے نا! تو وہ شکوے ہی کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا جس بندے کی زبان پر آپ شکوے دیکھیں، آپ سمجھ لیں کہ یہ اللہ سے راضی نہیں ہے اور یہ اللہ سے راضی نہیں ہے تو اللہ بھی اس سے راضی نہیں ہے۔ [احیاء علوم الدین: ۴/۳۴۵]

دکھ میں انسان اللہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے:

بلکہ ہمارے بزرگوں نے تو اس سے بھی بڑھ کر بات کی، وہ فرماتے ہیں:

سکھ دکھاں تے دیواں وار
دکھاں آن ملایم یار

”میں سکھوں کو دکھوں پر قربان کردوں کہ دکھوں نے مجھے میرے یار سے ملا دیا۔“

جب انسان دکھی ہوتا ہے، غم زدہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

تو بچا بچا کر نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اللہ کو بندہ بڑا پیارا لگتا ہے، جب اس کا دل ٹوٹتا ہے۔ اگرچہ مشکل ہوتی ہے، تکلیف ہوتی ہے، آنکھوں سے آنسو آرہے ہوتے ہیں، مگر اللہ کو پیار آرہا ہوتا ہے۔ آپ

خود غور کریں! چھوٹے بچے کو چوٹ لگ جائے تو وہ رو رہا ہوتا ہے اور ماں کے دل میں اس کا پیار آرہا ہوتا ہے، ماں اس کو چوم رہی ہوتی ہے۔ کہتی ہے: بیٹا! نہ رو، بیٹا! چپ کر جاؤ۔ تو جس طرح بچہ روتا ہے، ماں کو پیارا لگتا ہے، اسی طرح بندہ کئی مرتبہ تکلیف میں ہوتا ہے تو اللہ کو پیارا لگتا ہے۔ ہمارے مشائخ نے کہا: اللہ! ہم سکھوں کو دکھوں پر قربان کردیں کہ دکھوں نے ہمیں ہمارے یار سے ملا دیا۔ کسی شاعر نے کہا:

؎ تیرا غم بھی مجھ کو عزیز ہے
کہ وہ تیری دی ہوئی چیز ہے

کسی نے تو یوں کہا:

؎ تیرے عشق نے مجھے غم دیا تیرے غم کی عمر دراز ہو
وہ مقام آئے میرے خدا میرے عشق پہ تجھے ناز ہو

بندے پر ایک ایسا بھی مقام آتا ہے کہ بندے کے عشق پر اللہ کو ناز ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی محفل میں اس بندے کے تذکرے کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ میرا بندہ تہجد کے وقت مصلّے کے اوپر کھڑا ہے، اس کو میری محبت نے مصلّے کے اوپر کھڑا کر دیا ہے۔ اللہ کرے ہم بھی ان بندوں میں شامل ہوجائیں جن کے تذکرے اللہ تعالیٰ فرشتوں کی محفل میں فرماتے ہیں۔ ہم گناہ گار ہیں، خطا کار ہیں، اس قابل تو نہیں، لیکن اللہ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ چاہے تو ہمیں بھی ایسا بنا دے کہ ہم اللہ کو پسند آجائیں۔

مصیبت گناہ کی نجاست کی وجہ سے آتی ہے:

لیکن یہ جو پریشانیاں اور مصیبتیں ہیں، یہ ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔

آپ غور کریں کہ اگر چھوٹا بچہ اپنے کپڑوں کے اندر نجاست کر لے تو پھر وہ ماں کے پاس آتا ہے کہ امی! مجھے دھو دیں۔ اب ماں اس کو جھڑکتی ہے کہ تو نے کپڑے خراب کر دیے، پہلے کیوں نہیں بتایا۔ بچہ کہتا ہے: امی! میں آپ کو بتانے ہی کے لیے تو آیا تھا، مگر مجھے ضرورت اتنی تیز ہوئی کہ میرے کنٹرول میں نہ رہی اور میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ تو ماں تھوڑی دیر تو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے، پھر اسی بچے کو اٹھاتی ہے، پھر اس کے کپڑے اتار کر اسے نہلاتی ہے اور صاف کر کے اسے صاف ستھرے کپڑے دوبارہ پہناتی ہے اور خوشبو لگاتی ہے، پھر خوشبو لگا کر اس کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہم جب گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں تو اپنے آپ کو نجس بنا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نجس بندے کو پسند نہیں فرماتے، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ میرا بندہ گناہوں کی نجاست سے پاک ہو جائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کوئی مصیبت بھیج دیتے ہیں، کوئی پریشانی بھیج دیتے ہیں، کبھی عورت کو خاوند کی طرف سے پریشانی ملتی ہے، کبھی بیٹے کی طرف سے، کبھی کام کاروبار کی طرف سے، کبھی دوسری عورتوں کی طرف سے، کبھی ساس صاحبہ کی طرف سے۔ یہ جو پریشانیاں ہیں، یہ اللہ بھیجتے ہیں اور اس کا مقصد بندے کو دھو دینا ہوتا ہے کہ بندہ دھل جائے۔ چنانچہ جب پریشانی ملتی ہے اور بندے کے آنسو بہتے ہیں تو وہ آنسو ہمارے دل کی میل کو دھو دیتے ہیں۔

دیکھیں! جب بچے کو نہلایا جاتا ہے تو بچہ روتا ہے، لیکن وہ ماں بچے کی دشمن نہیں کہ اس کو رُلا رہی ہے، ماں تو خیر خواہ ہے، وہ اس کو پاک کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی بندے کے خیر خواہ ہیں، وہ بندے کو پریشان نہیں کرنا چاہتے، وہ تو بندے کو پاک صاف کرنا چاہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ بندے کو پریشانیاں اور مصیبتیں بھیج کر گناہوں سے پاک کر لیتے ہیں اور اپنے لیے خاص کر لیتے ہیں۔

سبق کا اعادہ:

تو پھر سن لیجیے کہ ذکر کے اثرات جو بدن پر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ

- ......انسان کی زبان پر حمد وثنا ہوتی ہے۔
- ......انسان کی آنکھوں میں حیا ہوتی ہے۔
- ......انسان کے ہاتھوں میں عطا ہوتی ہے۔
- ......انسان کے قلب میں خوف اور رجا ہوتا ہے۔اور
- ......انسان کے دماغ میں تسلیم اور رضا ہوتی ہے۔

یعنی ایسا بندہ اللہ سے ہر حال میں راضی ہوتا ہے۔آج کی اس محفل میں ہم اسی بات کو اپنے دل میں اُتاریں کہ ہم نے ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہنا سیکھنا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم پر مہربانی فرمائے اور ہمیں پریشانیوں اور مصیبتوں سے محفوظ فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں یہ تسلیم اور رضا والی صفت عطا فرمائے، تاکہ ہماری آنے والی پوری زندگی اس حال میں گزرے کہ ہم اپنے رب سے راضی ہوں۔ ہر حال میں راضی ہوں......صحت میں بھی راضی، بیماری میں بھی راضی ......خوشی میں بھی راضی، غم میں بھی راضی...... جب بھی کوئی پوچھے، فوراً کہا کریں: میں اپنے اللہ سے بہت راضی ہوں، بہت خوش ہوں۔ ہم اللہ سے خوش ہوں، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ہم سے خوش ہوں گے۔چنانچہ نبی علیہ السلام نے دعا سکھائی کہ بندے کو صبح وشام پڑھنا چاہیے:

((رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا)) ''میں اللہ سے راضی ہوں کہ وہ میرا رب ہے۔''

((وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا)) ''اور میں اسلام سے راضی ہوں کہ وہ میرا دین ہے۔''

((وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا)) [جامع ترمذی، حدیث:۳۳۸۹]

''اور میں نبی علیہ السلام سے راضی ہوں کہ وہ میرے نبی ہیں۔''

خوش نصیب لوگ:

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ الحمد للہ جن بچیوں نے محنت کی اور دین کو پڑھا، آج ان بچیوں کو سندیں جاری کی گئیں، ان کو انعام دیے گئے۔ وہ پرنسپل خواتین جو مختلف ادارے چلا رہی ہیں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے آپ کو بھلا دیتی ہیں، دن رات محنت کرتی ہیں، وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں کہ اللہ نے ان کو اس نیکی کے کام پر لگا رکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو کتنے لوگ ہم سے شکل میں اچھے، عقل میں اچھے، نسب میں اچھے، مگر اللہ نے ان کو دین کی محنت کی توفیق نہیں دی، وہ دنیا کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں اور ہمیں اللہ نے دین کی توفیق عطا فرمادی۔ مدارس بنانے کی اور مدارس چلانے کی نعمت عطا فرمادی۔

یہ مدارس دین کے قلعے ہیں اور یہ اللہ کے حبیب ﷺ کی پسندیدہ جگہیں ہیں۔ یاد رکھنا! مسجد جنت کے باغ ہیں اور مدارس محمدی باغ ہوتے ہیں۔ اور حدیث پاک میں ہے:

''وہ گھر جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اہل آسمان کے لیے ایسے چمکتا ہے جیسے اہل ارض کے لیے ستارے۔'' [شعب الایمان، حدیث: ۱۹۸۲]

تو ہمارے مدارس زمین کے ستارے ہیں، یہ چمکتے ہیں اور اللہ ان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جو بچیاں عالمہ بن گئیں اور انہوں نے محنت کی، وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں، ان کے والدین بھی مبارک باد کے لائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن اپنی مقبول بندوں میں شامل فرمائے اور ان کو اللہ تعالیٰ بلا حساب کتاب جنت عطا فرمائے۔

جنت میں بلا حساب جانے والے:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے رب کو سخی اور کریم پایا کہ ستر ہزار افراد کو جنت میں داخل فرمائیں گے، ان میں سے ہر ایک کے

ساتھ ستر ہزار عطا فرمائے۔ میں نے عرض کیا: میری امت اس تعداد کو نہیں پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اعراب یعنی دیہات کے رہنے والوں سے اس تعداد کو پورا کروں گا۔"

[مجمع الزوائد، حدیث:۱۸۷۱۱]

سبحان اللہ! یہ کون خوش نصیب ہوں گے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے؟ مشائخ نے لکھا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے۔ دستور بھی یہی ہے کہ جب کسی سے محبت ہو تو انسان کو حساب لیتے ہوئے بھی حیا آتی ہے۔ بلھے شاہ ؒ کا شعر ہے:

؎ سارے پھل گلاب نہ ہوندے
تے کورے کاغذ کتاب نہ ہوندے

یعنی خالی صفحوں کو جوڑ کر جلد باندھ دیں تو اس کو کتاب تو نہیں کہتے۔

؎ تے جے کر یاری لائیے بلھیا
تے یاراں نال حساب نہ ہوندے

انسان اگر کسی سے محبت کرے تو جس سے محبت ہوتی ہے، اس سے انسان حساب نہیں کرتا۔ قیامت کے دن ایسا ہی ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے حساب لیتے ہوئے شرمائیں گے۔

حضرت بنوری ؒ ایک حدیث پاک سنایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب اپنے بندوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے تو علماء سے فرمائیں گے:

((إِنِّيْ لَمْ أَجْعَلْ عِلْمِي وَحِلْمِي فِيكُمْ إِلَّا وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أَغْفِرَ لَكُمْ عَلَى مَا كَانَ فِيكُمْ وَلَا أُبَالِي)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث:۱۳۸۱]

''میں نے تمہارے دلوں میں اپنا علم اور حلم اس لیے ودیعت کیا ہے، تاکہ تمہاری مغفرت کروں اور مجھے اس کی کوئی پروانہیں۔''

اے علماء کی جماعت! میں نے تمہارے سینوں کو علم کے لیے جو چنا تھا، مخصوص کرلیا تھا تو وہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ آج میں سارے بندوں کے سامنے تمہیں رُسوا کروں، جاؤ! تم بلا حساب جنت میں چلے جاؤ۔ اس دن پتا چلے گا کہ اللہ کے ہاں علم کا کتنا مقام ہے اور اللہ نے علماء کی کتنی قدر دانی کی۔

ہم بھی ان تمام عالمہ بچیوں کو مبارکباد دیتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا ان پر کرم ہوا اور اللہ نے ان کو اپنے دین کے لیے چن لیا۔ چنانچہ جو پڑھ رہی ہیں وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں، جو پڑھ چکی ہیں وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں۔ جو پڑھا رہی ہیں اور ادارے چلا رہی ہیں، وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں بھی اکٹھا فرمائے اور اللہ ہم سے راضی ہو جائے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

سلوک کو طے کرنا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ○بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
﴿وَالَّذِیْنَ جٰھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (العنکبوت:٦٩)
سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ○وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

انسان پر اللہ کی تین نعمتیں:

اللہ رب العزت نے ہر انسان کو تین نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک انسان کا قلب، دوسرا انسان کا نفس اور تیسرا انسان کی عقل۔ یہ تین الگ الگ چیزیں ہیں، قرآنِ مجید میں اور احادیث مبارکہ میں تینوں کا الگ الگ تذکرہ ہے۔

① قلب:

قلب جذبات کا مقام ہے۔ جذبات خوشی کے ہوں یا غم کے ہوں، محبت کے ہوں یا نفرت کے ہوں، سخاوت کے ہوں یا بخل کے ہوں، ان سب جذبات کا تعلق قلب

کے ساتھ ہے۔

2 نفس:

انسان کا نفس خواہشات کا مقام ہے۔ خواہشات جتنی بھی ہیں ان کا تعلق نفس کے ساتھ ہے، وہ اچھی ہوں یا بُری ہوں۔ اچھی خواہش کہ میں اللہ کا دوست بن جاؤں، تہجد گزار بن جاؤں، متقی بن جاؤں، مجھے جنت مل جائے، اللہ مجھ سے راضی ہو جائے، سب خواہشات ہیں، مگر اچھی اور مستحسن ہیں۔ اور بُری خواہشات کہ لوگ مجھے پہچانیں، ہر کام میں میری مرضی چلے۔ تو خواہشات اچھی بھی ہوتی ہیں، بُری بھی ہوتی ہیں۔ جذبات اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی ہوتے ہیں۔

3 عقل:

اور تیسری چیز ہے انسان کی عقل۔ عقل میتھ کو پروسیسر کی طرح ایک ایسا عضو ہے کہ اس کو جو جذبہ دے دو، یا خیال دے دو، وہ اس کو پراسیس کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کا پروسیسر ہے، اپنا کچھ نہیں ہے۔ جیسی خواہش ہوگی، ویسے خیالات پروسیس کرے گا۔ دل میں جیسا جذبہ ہوگا ویسی ہی سوچ سوچے گا۔ تو وہ ان دونوں سے سگنل لے کر پروسیس کرتا رہتا ہے۔ ذہن میں نیکی ہوگی تو نیکی کے خیالات آتے رہیں گے، بُرائی ہوگی تو بُرے خیالات آتے رہیں گے۔ گویا جو اصل نعمتیں ہیں وہ دو ہی ہیں، قلب اور نفس۔

اصلاح کے دو طریقے:

اور انسان کی اصلاح کے دو ہی طریقے ہیں:

1. اس کا نفس سنور جائے۔
2. اس کا قلب سنور جائے۔

اور دونوں کی دلیل قرآن پاک سے ہے۔ اسی لیے تزکیۂ نفس کا تذکرہ فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ [الاعلیٰ: ۱۴]

''فلاح اس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی۔''

یہ نفس کا تذکرہ ہے۔

﴿وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○﴾ [الشمس: ۷ تا ۹]

''اور انسانی جان کی، اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری کی ہے۔ فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے۔''

تو گویا نفس کا تزکیہ ہونے سے بھی بندہ سنور جاتا ہے۔

﴿وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ﴾ [فاطر: ۱۸]

''اور جو شخص پاک ہوتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لیے پاک ہوتا ہے۔''

تو تزکیہ نفس بھی ضروری ہے۔

اور دوسرا ہے قلب کا سنورنا، منور ہونا، ٹھیک ہونا، یہ بھی ضروری ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی بہت ساری جگہوں پر قلب کے بارے میں فرمایا:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾﴾ (محمد: ۲۴)

''بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا دلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں جو دلوں پر پڑا کرتے ہیں؟''

تو دلوں کا تذکرہ بار بار آیا۔ حدیثِ پاک میں بہت وضاحت سے بتایا:

((أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ

الجَسَدُ کُلُّهُ. أَلَا وَهِيَ القَلْبُ)) [صحیح بخاری، حدیث:۵۲]

''بے شک بنی آدم کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب یہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اور یہ سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے، جان لو کہ یہ قلب ہے۔''

تو قلب کے سنورنے سے انسان کا سنورنا بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور نفس کے سنورنے سے انسان کا سنورنا بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اصلاح کے یہ دو ہی طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ

اصلاحِ نفس سے اللہ کا قرب پانا

اللہ رب العزت کی مشیت نے پسند کیا کہ انسان نفس کا تزکیہ کرے اور اللہ کا قرب پائے۔ چنانچہ تاریخِ انسانی کو شروع سے پڑھ کر دیکھ لیں، نفس کے مجاہدے کیے جاتے تھے۔ اس لیے کہ یہ نفس اللہ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ کائنات میں کسی بت کی اتنی پرستش نہیں کی گئی جتنی پرستش نفس کے بت کی کی گئی ہے۔ اس کی پرستش صرف کافر اور مشرک ہی نہیں کرتے، کلمہ پڑھنے والے بھی کرتے ہیں۔ اس کی پرستش سے چھٹکارا قسمت والے ہی پاتے ہیں، اس لیے یہ سب سے بڑا دشمن ہے، شیطان سے بھی بڑا دشمن۔ وہ کیسے؟ کہ عزازیل بڑا عبادت گزار تھا، احادیث سے ثابت ہے کہ اس نے ہزاروں سال عبادت کی، چپے چپے پر سجدے کیے، تبھی تو اونچا مقام ملا تھا۔ لیکن وہ ملعون کیوں ہوا؟ یہ ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت تو کوئی شیطان نہیں تھا جس نے اس کو بہکایا ہو، تو وہ کیوں ملعون بنا؟ اس کو اس کے نفس نے ملعون بنایا۔ یہ

نفس ایسا بد بخت ہے کہ یہ عزازیل جیسے عبادت گزار کو بھی شیطان بنا دیتا ہے، تو یہ شیطان کا بھی گرو گھنٹال ہے۔ شیطان ہمارا دشمن اور نفس اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن ہے۔ اسی لیے ہمارے مشائخ فرماتے ہیں: اے دوست! تو نفس کو پالنے میں لگا ہوا ہے اور نفس تجھے جہنم میں دھکا دینے میں لگا ہوا ہے۔

مجاہدۂ نفس تاریخِ انسانیت میں موجود ہے:

نفس کی اصلاح شروع سے تاریخِ انسانیت میں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے لیے بڑے مجاہدے کیے جاتے تھے، اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کو مشقت میں ڈالا جاتا تھا۔ آپ بنی اسرائیل کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لیں، ان کے ہاں راہب ہوتے تھے۔ یہ کون لوگ ہوتے تھے؟ اچھے لوگ تھے، اپنے وقت کے عبادت گزار تھے، نیکوکار تھے۔ ستر ستر سال عبادت میں گزارنا، چار سو سال عبادت میں گزارنا، کوئی آسان کام ہے۔ اللہ خود فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا﴾ (المائدہ:۸۲)

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم اور بہت سے تارک الدنیا درویش ہیں۔''

دیکھا! اچھے لوگ تھے تو وہ اللہ سے محبت کرنے والے تھے۔ ان کی فکر یہ تھی کہ نفس کو پامال کرو۔ چنانچہ وہ کم کھاتے تھے، کم پیتے تھے، کم سوتے تھے۔ عبادت کا ایک کمرہ بنا کر اُس کو صومعہ کہا کرتے تھے اور بس اس کے اندر رہتے تھے۔ ان کو مخلوق سے کوئی واسطہ نہیں تھا، شادی بھی نہیں کرتے تھے کہ یہ بھی رکاوٹ نہ بنے۔ یوں دنیا سے منہ موڑ کر اللہ کو چاہنا کوئی آسان کام ہے؟ کر کے دیکھیں ذرا، ہم تو ایک ہفتہ نہیں گزار

پائیں گے۔ ہمارا تو ایک دن فون واپس لے لیا جائے تو شاید زندگی مشکل ہو جائے۔ وہ تو تنہائی اور خلوت میں اللہ کی یاد میں بیٹھتے تھے، سجدوں میں رہتے تھے۔

چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ ایک عابد نے کئی سو سال عبادت کی اور اس نے دعا مانگی: اللہ! جب میری موت آئے تو سجدے میں آئے۔ اس کو سجدے میں ہی موت آئی، ایک پہاڑ کی چوٹی پر اس کی قبر ہے۔ [مستدرک الحاکم، حدیث: ۷۶۳۷]

مطلب یہ کہ یہ وہ لوگ تھے، جو واقعی اللہ کے عاشق تھے، اللہ کو ٹوٹ کر چاہتے تھے، سب خواہشات چھوڑ دی تھیں۔

مجاہدۂ نفس میں تجاوز:

مگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ یہ تو کہیں نہیں کہا گیا تھا کہ تم شادی نہ کرو، اپنوں سے رابطہ نہ رکھو، اس طرح تم اللہ کا قریب نہیں پا سکو گے۔ یہ بات انہوں نے خود گھڑ لی تھی۔ یعنی نفس کا مجاہدہ تو شروع سے کہا گیا تھا، مگر اس مجاہدے میں اتنا آگے بڑھ جانا کہ بالکل ہی بے تعلق ہو جانا، یہ درست نہیں تھا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا﴾

''اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے وہ انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی۔''

مگر یہ انہوں نے محبت میں کیا تھا، حکم نہیں تھا کہ تم ایسے رہو۔ چونکہ جب علم نہ ہو تو عشق بدعات سکھاتا ہے اور عشق نہ ہو تو علم عجب اور تکبر میں ڈال دیتا ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔

نبی علیہ السلام کی تعلیم:

نبی علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم دی۔ مدینہ طیبہ

میں جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو پہلا خطبہ جو دیا، اس میں فرمایا:

((أَحِبُّوا اللّٰهَ مِنْ كُلِّ قُلُوْبِكُمْ)) [جامع الاحادیث للسیوطی، حدیث:۴۳۹۱۵]

''تم اللہ سے پورے دل سے محبت کرو۔''

یہ مدینہ کا پہلا خطبہ ہے جو نبی علیہ السلام نے دیا۔ نبی علیہ السلام نے میسج دیا کہ دیکھو! دل ایک ہے اور ایک ہی کے لیے ہے۔

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ﴾ [الاحزاب:۴]

''اللہ نے کسی بھی شخص کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کیے۔''

کہ ایک دل رحمٰن کو دے دے اور ایک نفس و شیطان کو دے دے۔ تو دل ایک ہے اور ایک ہی کے لیے ہے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا پورا دل اللہ کے لیے تھا۔ یہیں پر فرق ہے۔ ہم نے کلمہ بھی پڑھا، ہم مسلمان بھی کہلائے، ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں، لیکن پورا دل اللہ کو ابھی نہیں دیا۔ دل کا کچھ حصہ ہے جس میں بت ہیں، کسی میں عورت ہے، کسی میں مال ہے، کسی میں جاہ ہے۔ ع

بتوں کو توڑ تخیل کے ہوں یا پتھر کے

ان بتوں کو توڑنا پڑے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو نبی علیہ السلام کے ہاتھوں بتوں سے پاک کروایا تھا، لات و منات تڑوا دیے تھے، ہمیں بھی لات و منات توڑنے کا حکم ہے کہ ایک ایسا وقت زندگی میں آئے کہ ہم بھی کہیں: اللہ! تَرَكْتُ اللَّاتَ وَ الْعُزّٰى جَمِيْعًا میں نے سب لات و منات کو چھوڑ دیا، بس سارا دل آپ کے لیے۔ اور تصوف کی پوری محنت کا مقصد یہی ہے کہ پورا دل ہم اللہ کو دے دیں، اس میں ماسویٰ کی محبت نہ رہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجاہدۂ نفس:

صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ رب العزت سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہمیں اللہ کے قرب کا اعلیٰ ترین مقام مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنے نفس کے خوب خلاف کرتے تھے۔ چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تین آدمی آپ کی عبادت کا حال پوچھنے آئے، جب ان سے بیان کیا گیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو بہت کم خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کس طرح کرسکتے ہیں؟ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ سب معاف ہوگئے ہیں۔ ایک نے کہا: میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا: میں نکاح نہیں کروں گا اور عورت سے ہمیشہ الگ رہوں گا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری بہ نسبت بہت زیادہ ڈرنے والا اور خوف کھانے والا ہوں، پھر روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور ساتھ ساتھ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ [صحیح بخاری، حدیث: ۵۰۶۳]

اس کا مطلب یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی جذبہ تھا کہ نفس کو پامال کرنے کے لیے جو کرسکتے ہو کرلو۔ تو نبی علیہ السلام نے ان کو ذرا Balance (متوازن) کیا کہ دیکھو! رہبانیت کی لائن پر مت جاؤ، تم شریعت کے دائرے میں زندگی گزارو۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر اس کے بعد ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرنا شروع کر دیا۔

بعض صحابہ ایسے بھی تھے کہ ان کی بیویاں نبی علیہ السلام کے پاس پہنچ گئیں۔ کہنے لگیں: اے اللہ کے حبیب! ان کو تو ہم سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ تو نبی علیہ السلام نے پھر

ان کو سمجھایا کہ دیکھو بھئی! بیویوں کے بھی ہمارے اوپر حقوق ہیں۔حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک خاتون آئی کہ میرا خاوند ساری رات عبادت کرتا ہے، سارا دن روزہ رکھتا ہے۔عمر رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں: کیا مطلب؟ کہتی ہے: ساری رات عبادت کرتا ہے، سارا دن روزہ رکھتا ہے۔تو کعب رضی اللہ عنہ قریب بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے: اس نے بڑے اچھے انداز سے خاوند کی شکایت لگائی ہے۔تو وہ کہنے لگے: یہ تو تعریف کر رہی ہے، کہنے لگے: تعریف تو کر رہی ہے، لیکن جو ساری رات عبادت کرے گا، سارا دن روزہ رکھے گا، بیوی کے لیے وقت کہاں سے بچے گا؟ [تفسیر القرطبی:۵/۱۹]

تو اس کا مطلب یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہ اتنی زیادہ عبادت کیا کرتے تھے۔

اکابر کا خواہشاتِ نفس کو توڑنا:

ایک چیز آپ کو ان کی زندگی میں عام ملے گی کہ نفس کی خواہش کو توڑنا ان کے اوپر ختم تھا۔ ذرا کسی بات میں نفس کی خواہش شامل ہوتی تھی تو فوراً محاسبہ کرتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جب دیکھتے تھے کہ ایک چیز نفس کے اندر آئی ہے تو فوراً اس کے خلاف کرتے تھے۔تو یہ نفس کے خلاف کرنا، خواہشات کو توڑنا، یہ تزکیہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے جو سلف صالحین سے چلا آرہا ہے۔اور صحابہ کے ابتدائی دور میں یہی طریقہ چلا۔ چنانچہ تابعین کی زندگی کو دیکھ لیں، تبع تابعین کی زندگی کو دیکھ لیں، وہ اپنے اوپر اس قسم کی پابندیاں لگاتے تھے۔

۞......عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بیمار ہیں، آخری وقت ہے، دل میں چاہت ہوئی کہ میں مچھلی کھاؤں۔ گھر والوں کو بتا دیا کہ مچھلی منگواؤ۔ انہوں نے مچھلی منگوائی، پکائی اور عین آخری وقت میں جب کھانے کا وقت آیا تو سائل آگیا، وہ مچھلی اُٹھا کر اس کو دے دی۔

۞......عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ بنے تو انہوں نے نیت کر لی کہ آج کے بعد بس میں غسلِ جنابت نہیں کروں گا۔ اب بتائیں یہ کوئی فرض تو نہیں ہے، یا شرط تو نہیں ہے خلیفہ بننے کی، مگر بس ایک احساسِ ذمہ داری تھا کہ اب میری مسئولیت بڑھ گئی ہے، لہٰذا اب میں اپنا پورا وقت اللہ کے لیے فارغ کروں گا، یہ حال تھا۔

مجاہدات سے تزکیہ......اکابر کا طریقہ:

صحابہ اور تابعینؒ کے بعد یہ سلسلہ پوری اُمت میں چلا کہ اللہ کو پانے کے لیے نفس کا تزکیہ ضروری اور نفس کے تزکیہ کے لیے مجاہدہ ضروری۔ سلف صالحین واقعی بہت مجاہدے کرتے تھے۔ وہ راتوں کو عبادت کرتے تھے، عشاء کے وضو سے فجر کی نمازیں پڑھتے تھے، تلاوتِ قرآن میں لگے رہتے تھے۔ ان کے لیے رات کو جاگنا ایک عام چیز تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں اگر کوئی جاتا تو وہاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح قرآنِ مجید پڑھنے کی آواز آتی تھی، اس لیے کہ وہ ایک زندہ شہر تھا، زندہ لوگ تھے، عبادتیں کرتے تھے۔ تو مجاہدۂ نفس کر کے اپنے آپ کو شریعت کی لگام دینا اور اپنے آپ کو نیکی کے اوپر لگانا ہمارے اکابر کا طریقہ رہا ہے، انہوں نے خوب مجاہدے کیے۔

۞......معمولی کھانا کھاتے تھے، ایک یا دو لقمے، ایک گھونٹ پانی پیتے تھے۔ آپ حضرت عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احوال الصالحین'' پڑھ کر دیکھ لیں، آپ حیران ہو جائیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اتنا کم کھانا کھاتے تھے کہ ہمیں ہفتے کے بعد جا کر اجابت (بیت الخلاء) کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اور کم کھانے کی وجہ سے جس طرح بکریاں مینگنیاں کرتیں ہیں اس طرح اجابت ہوتی تھی۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ہیں چونکہ کھاتا تھا تو مجھے روزانہ ایک مرتبہ بیت الخلاء جانے کی ضرورت پیش آئی تو میری والدہ نے مجھے کہا کہ حکیم کے پاس جاؤ، تمہارا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ بیت الخلاء جاتے تھے تو ماں کہتی ہے کہ حکیم کے پاس جاؤ تمہارا پیٹ خراب ہو گیا ہے، اور ہم ماشاء اللہ! جتنی نمازیں ہیں اس سے بھی زیادہ مرتبہ جاتے ہیں۔ بیت اللہ پانچ مرتبہ جاتے ہیں اور بیت الخلاء سات مرتبہ جاتے ہیں۔

۞...... ہمارے بعض اکابر تو روزے رکھتے تھے۔ پانی سے روزہ، پانی سے افطار...... پانی سے روزہ، پانی سے افطار۔ قرآنِ پاک میں اس کا تذکرہ ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ نے تین روزوں کی منت مان لی...... شہزادے بیمار ہو گئے تھے تو نیت یہ کی کہ یہ شفا یاب ہو گئے تو ہم تین روزے رکھیں گے...... پہلا روزہ رکھا اور افطاری کا وقت آیا تو مانگنے والے آ گئے تو کھانا ان کو دے دیا، پھر اگلے دن افطاری کے وقت کچھ پکایا تو کوئی اور آ گیا اس کو دے دیا، پھر تیسرا دن ہوا تو تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، لہٰذا اپنا کھانا ان کو دے دیا۔

۞...... سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ مال آیا، شاید پچاس ہزار درہم یا دینار تھے۔ خادمہ کو کہا کہ مدینہ کی بیواؤں کو بلاؤ! وہ ان دیناروں کو تقسیم کرتی رہیں، کرتی رہیں، آخر پر خادمہ آئی کہ تھوڑے سے پیسے دے دیں کہ افطاری کا سامان لے آؤں۔ فرمانے لگیں: مجھے پہلے بتاتیں اب تو میں نے سب تقسیم کر دیا۔ یعنی خود روزے سے ہیں، اتنا مال آنے کے باوجود اپنی افطاری کے لیے کچھ نہیں بچا۔ تو یہ چیز بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف بہت ہی مجاہدہ کرتے تھے۔

۞...... نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی زندگی میں تین مسلسل دن ایسے نہیں آئے کہ آپ نے تینوں دن پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ ایک دن کھایا تو دوسرے دن فاقہ، دو دن کھایا تو

تیسرے دن فاقہ، تین دن متواتر نہیں گزر سکے۔ ایک روایت میں ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ دن میں دوسری مرتبہ کھانا کھا رہی تھیں تو نبی علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: عائشہ! کھانے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی علیہ السلام کے بعد سب سے پہلی تبدیلی جو میں نے اُمت میں دیکھی، وہ دو وقت کھانا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اکابر نفس کے مجاہدات کے ذریعے عبادت کرتے تھے اور اپنے رب کو راضی کر کے قرب کا مقام حاصل کرتے تھے۔

دوسرا طریقہ

اصلاحِ قلب سے اللہ کا قرب پانا

وقت کے ساتھ ساتھ ہمتیں کمزور ہوتی گئیں، قویٰ کمزور ہو گئے تو مشائخ امت نے محسوس کیا کہ اب لوگوں میں وہ ہمتیں نہیں رہیں۔ اب جب مشائخ امت نے دیکھا کہ وہ مجاہدے کرنے تو بہت مشکل ہو گئے ہیں تو انہوں نے اللہ سے دعا مانگی: اللہ! ہم کمزور ہیں، تو ہم پر رحمت فرما دے اور آسانی کا کوئی معاملہ فرما دے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی دعا اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوئی اور رب کریم نے ان کو ایک ایسا طریقہ واضح فرمایا کہ جس میں نفس کے بہت مجاہدے نہیں ہیں، آسان طریقہ ہے، کمزوروں کا طریقہ ہے۔ وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ قلب پر محنت کرنا اور کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا قرب پانا۔

متاخرین کا سلوک:

ہمارے مشائخِ نقشبند نے لکھا ہے کہ پہلے سلوک متقدمین کے سلوک ہیں۔ چشتیہ،

قادریہ اور سہروردیہ سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چلے اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھے۔ امت کے پہلے حصے میں اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو خوب اعلیٰ درجات سے نوازا۔ یہ جو نقشبندیہ سلوک ہے، یہ متاخرین کا سلوک کہلاتا ہے۔ امت کے آخری حصے میں کمزوروں کا سلوک ہے۔ تو اللہ رب العزت نے مشائخِ نقشبند پر واضح فرمایا کہ بھئی! نفس کے مجاہدے کرنے کے بجائے اصلاح کا ایک طریقہ اور بھی ہے، جس کو کہتے ہیں ''تصفیۂ قلب''۔ اب تک امت نفس کے مجاہدوں سے تزکیہ پاتی تھی، تم قلب کے تصفیہ کے ذریعے سے بھی اپنے نفس کو تزکیہ میں لا سکتے ہو۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: جب دل سنورتا ہے تو پورا جسم سنور جاتا ہے، لہٰذا قلب کے سنورنے سے نفس کی اصلاح خود بخود اس کے ضمن میں ہو جاتی ہے۔ دل میں جذبہ ہو تو انسان نفس کو بھی پامال کرتا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ الیکشن میں سیٹ حاصل کرنے کے لیے حصہ لیتے ہیں تو ان کو ووٹ چاہیے ہوتا ہے۔ اب دل میں ایک شوق ہے کہ مجھے یہ سیٹ حاصل کرنی ہے۔ سیٹ حاصل کرنے کے لیے وہ غریب کے پاس بھی جائیں گے، ان کے پاس بیٹھیں گے، باتیں کریں گے، کھانا کھائیں گے، تو دیکھو! اپنے نفس کو پامال کر رہے ہیں نا...... دل میں جذبہ پیدا ہوا تو نفس کو پامال کرنا آسان ہو گیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ واقعی جب ووٹنگ کے دن ہوتے ہیں تو ان کی اولیاء جیسی زندگی ہوتی ہے۔ کھانا یاد نہیں ہوتا، پینا یاد نہیں ہوتا، راتوں کو سونا یاد نہیں ہوتا، چوبیس گھنٹے لگے ہوتے ہیں بیچارے۔ تو دیکھو! قلب کے اندر ایک جذبہ ہے جس کی وجہ سے نفس پر ساری پابندیاں آ گئیں۔

تو یہ جو متاخرین کا سلوک ہے، اس سلوک میں قلب پر محنت کی جاتی ہے اور نفس اس کے ضمن میں خود بخود پامال ہو جاتا ہے۔ محبت چیز ہی ایسی ہے کہ محبوب کی خاطر سب

کچھ قربان کر دینا آسان ہو جاتا ہے۔

سلوکِ نقشبندیہ کے دو پَر:

دوسرے مشائخ نے فرمایا: ہم مجاہدۂ نفس کے ذریعے سے سلوک طے کرواتے ہیں، ہمارے مشائخ نقشبند نے کہا: ہم اتباعِ سنت کے ذریعے سے سلوک طے کرواتے ہیں۔تو کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت، یہ اس سلسلہ میں دو بنیادی چیزیں ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ دو پَر ہیں جن سے بندہ اُڑتا ہے۔ ہمارے مشائخ کی کتابوں میں یہ بات آپ کو بہت کثرت سے ملے گی کہ ہمارے سلوک کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: کثرتِ ذکر، اتباعِ سنت اور صحبتِ شیخ۔صحبتِ شیخ تو یوں سمجھ لیں کہ اسٹیرنگ پر بیٹھا کوئی شخص سمت ٹھیک کر رہا ہوتا ہے، اصل پَر دو ہی ہیں، کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت۔

اب کثرتِ ذکر اور اتباع سنت میں وہ کھانے پینے کا مجاہدہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔ حضرت نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا: حضرت! میں کتنا کھاؤں؟ فرمایا: ''تو اچھا کھا اور کام اچھا کر۔'' اگر تم عبادت کرتے ہو تو پھر جتنی ضرورت ہے اس کے تحت تم کھاؤ بھی، اس میں کیا حرج ہے؟ جو جانور کام اچھا کرے تو مالک اس کو چارا ڈالتے ہوئے پریشان تو نہیں ہوتا۔

سنت کی پابندی سب سے بڑا مجاہدہ ہے:

ہمارے ہاں اصل مجاہدہ یہ ہے کہ ہر کام کو سنت کے مطابق کیا جائے۔ اگر غور کریں تو یہ سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے بیس سال مجاہدہ کیا لیکن ہر کام سنت کے مطابق کرنے سے بڑا مجاہدہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ ایک شخص جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں دس سال رہا، پھر ایک دن کہنے لگا:

حضرت! میں جاتا ہوں کسی اور کے پاس، مجھے اجازت دیں۔ پوچھا: کیوں؟ کہنے لگا: میں تو آیا تھا کرامت دیکھنے کے لیے، لیکن میں نے دس سال میں کوئی کرامت ہی نہیں دیکھی۔ فرمانے لگے: اچھا! یہ بتاؤ کہ ان دس سالوں میں کوئی عمل سنت کے خلاف دیکھا؟ کہا: نہیں، فرمایا: اس سے بڑی کرامت اور کیا ہوسکتی ہے کہ دس سال میں کوئی کام سنت کے خلاف ہی نہ ہو۔ تو سب مجاہدوں سے بڑا مجاہدہ اتباعِ سنت ہے۔

کثرتِ ذکر سے مجاہدہ آسان:

جب انسان کثرت سے ذکر کرتا ہے تو یہ مجاہدہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید میں کثرتِ ذکر کا حکم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝٤١﴾ [الاحزاب: ۴۱]

”اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔“

﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾ [الاحزاب: ۳۵]

”اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد ہوں یا ذکر کرنے والی عورتیں۔“

ہماری بنیادی کمزوری:

ہماری جو بنیاد کمزور ہے وہ یہ کہ ہم کثرتِ ذکر کرتے ہی نہیں۔ یہ پانچ منٹ کا مراقبہ، دس منٹ کا مراقبہ، یہ کیا بات ہوئی؟ بھئی! اگر دوسری کلاس کا طالب علم دس منٹ روزانہ کتاب کھول کر پڑھے تو کیا سال کے آخر پر پاس ہوجائے گا؟ جو دس منٹ روزانہ پڑھے وہ دوسری کلاس میں پاس نہیں ہوسکتا، تو ولایت کے امتحان میں کیسے پاس ہوگا؟ دوسری کلاس کے لیے تو اس کو چار گھنٹے اور چھ گھنٹے سکول میں لگانے پڑتے

ہیں، حق تو یہ بنتا تھا کہ ہم بھی چار چار گھنٹے مراقبہ کرتے۔ اب کوئی پوچھے کہ کتنا وقت نکالیں؟ بھئی! انٹرنیٹ پر ٹائم لگتا ہے نا؟ گھنٹوں لگتے ہیں، منٹوں کی بات تو کوئی کرے ہی نہ، جو منٹوں کی بات کرے گا وہ جھوٹ بولے گا، الا ماشاء اللہ۔ اس مصیبت کو ایک دفعہ جس نے کھول لیا اس کا گھنٹہ گیا، پتا ہی نہیں چلتا گھنٹہ لگنے کا۔ تو اگر سکرین کے سامنے گھنٹہ بیٹھ سکتے ہیں تو پھر مراقبے میں کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ حق تو یہ تھا کہ ہم گھنٹوں مراقبہ کرتے، لیکن ہم نہیں کرتے۔ شوق میں آکر بیعت ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں: حضرت! بس تلاوت بھی کر لیتا ہوں، درود شریف اور استغفار بھی کر لیتا ہوں، لیکن مراقبہ نہیں ہوتا۔ بھئی! جو اصل دوا تھی، اینٹی بایوٹک تھی، وہ تو لی ہی نہیں، فائدہ کیسے ہو؟

ہماری مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک Dehydrated plant (مرجھایا ہوا پودا) ہوتا ہے، جس کے پتے مرجھائے ہوئے ہوتے ہیں، پھل بھی کمزور ہوتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ اس کو پانی تھوڑا ملتا ہے۔ ایسے ہی ہم Dehydrated قسم کے صوفی ہیں۔ ذکر کی کثرت نہیں کرتے اور پھر ہماری نظر بھی خطا کرتی ہے، زبان بھی جھوٹ بول دیتی ہے، فلاں بھی ہو جاتا ہے اور فلاں بھی ہو جاتا ہے۔ یہ سارے Symptoms (علامات) ہمارے اندر ہوتے ہیں۔ تو قلتِ ذکر ہماری بنیادی بیماری ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں اللہ کا تعلق ملے تو ہمیں اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا پڑے گا۔ چلتے پھرتے، لیٹے بیٹھے، اللہ کو یاد کریں۔ ایسی کیفیت ہو جائے کہ بس انسان کا دل کہے کہ اللہ! ع

تیری یادوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

جیسے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ”اے اللہ! دن اچھا نہیں لگتا، مگر تیری یاد کے ساتھ، رات اچھی نہیں لگتی، مگر تجھ سے راز و نیاز کے ساتھ“۔

قلتِ ذکر کا نتیجہ:

اور جو ذکر کم کریں وَلَا یَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيۡلًا ان کی علامت بتا دی:

﴿مُذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ﴾

(النساء:۱۴۳)

اور ہم بھی آج متذبذب ہی ہیں، پورے دنیا دار ہیں نہ پورے دین دار ہیں۔ دنیا داروں کے مجمع میں جا کر بیٹھیں تو وہ کہتے ہیں: یہ مولوی کہاں سے آ گیا؟ جاؤ، وہ بھی ہمیں بھگا دیتے ہیں اور دین داروں کے مجمعے میں آ کر بیٹھو تو اپنے گناہوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہم دین داروں میں بھی نہیں۔ واقعی صحیح بات ہے کہ ہمارے نفس کی حالت وہی ہے کہ دھوبی کا کتا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں۔

؎ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

سلوک کی شاہراہ:

ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہم بدلیں تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت کا اہتمام کریں۔ اتباعِ سنت سے مراد یہ کہ ہر کام کو سنت کے مطابق کریں۔ کھانا، پینا، لباس، معاملات، معاشرت ہر کام بس سنت کے مطابق کرتے جائیں، یہ آسان طریقہ ہے اپنے آپ کو سنوارنے کا۔ تو کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت سے یہ سلوک آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔ یہ شاہراہ ہے، بندہ اس پر بھاگتا چلا جاتا ہے۔

آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک بندے کو کہہ دیا جائے کہ جی آپ یہاں سے بغیر سواری کے حج پر جائیں تو وہ مشکل میں پڑ جائے گا۔ چلے گا...... راستے میں کھانا نہیں...... پینا

نہیں...... کہاں ٹھہرے گا؟...... کیسے سمندر عبور کرے گا؟...... ریگستان آئیں گے...... پہاڑ آئیں گے...... کھڈے ہوں گے، اس کے لیے پہنچنا تو واقعی بڑا مشکل کام ہے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ یہاں سے بندے کو ہوائی جہاز پر بٹھا دو، چلو بھئی! سعودی عرب پہنچ جاؤ۔ یہ ہمارا سلوک تو اسی طرح By Air (بذریعہ جہاز) پہنچانے والا سلوک ہے، اسی لیے اسے متاخرین کا سلوک کہا جاتا ہے۔ یہ آسان ہے، بہت آسان ہے۔ بس دو چیزوں کی پابندی ضروری ہے: ہر کام میں سنت کی اتباع اور ذکر کی کثرت۔

مصروف لوگ بھی کثرتِ ذکر کر سکتے ہیں:

ذکر کی کثرت تو ایسے ہو کہ بندہ جو وقت ملے، دس منٹ ملیں، پندرہ منٹ ملیں، گھنٹہ ملے، دو ملیں، فوراً اللہ کی یاد میں لگ جائے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں: جی! ہم تو دفتر یا بزنس کی وجہ سے مصروف رہتے ہیں، تو شریعت کہتی ہے کہ تم دفتر نہ چھوڑو، بزنس نہ چھوڑو، کرتے رہو، مگر دل اللہ کی طرف رکھو۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ دل میں کسی اور کا خیال رہے، نہیں! دل میں اللہ کو یاد کرو۔

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النور:۳۷)

”وہ لوگ کہ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔“

تجارت اور خرید فروخت میں بھی انسان اللہ کو یاد کرے۔ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ [جامع ترمذی، حدیث:۱۲۰۹]

مقصود یہ ہے کہ دل میں ہر وقت اللہ کی یاد رہے۔

یادِ خدا اپنا پتا دیتی ہے:

ہم نے تو دیکھا ہے کہ جب دل کہیں اٹک جاتا ہے تو چوبیس گھنٹے اسی کی یاد رہتی ہے۔ یہ نوجوان ساتھی ہیں، آپ ذرا غور کرنا، جہاں ٹھہریں گے بھاگیں گے باہر، آج ہم باہر سے آئے تو کوئی اِدھر فون پر باتیں کر رہا ہے، کوئی اُدھر فون پر باتیں کر رہا ہے، پوری گلی میں ہم نے جگہ جگہ دیکھا تو دل اٹکا ہوا ہے نا کہیں نہ کہیں۔ اور بعد میں تو پھر مجلس میں رِنگ بند کی ہوتی ہے، لیکن دل دھڑک رہا ہوتا ہے، جب وائبریشن ہوتی ہے تو اس کو ہاتھ میں لے کر بھاگتے ہیں...... آ گیا میسج، آ گیا فون۔ تو جب دل اٹکا ہوا ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ دل کہیں اٹکا ہوا ہے۔ جن کا اللہ کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہوتا ہے، ان کے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہ اپنا دل دے چکے ہیں، یہ کسی کے بن گئے ہیں۔

ع دلوں مَن لئی تیری بن گئی

اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اللہ! میں نے اپنا دل آپ کو دے دیا۔ پھر ان کو مصلیٰ پر دیکھیں گے، ان کو تلاوت کرتے دیکھیں گے، ان کو تہجد پڑھتا دیکھیں گے، سبحان اللہ!

﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (الفتح:۲۹)

جو ذکر کر رہے ہوتے ہیں، ان کے چہروں سے پتا چل جاتا ہے۔ تو دو چیزیں ہیں: کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت، ان دو چیزوں سے یہ سلوک طے ہو جاتا ہے۔

نظام الاوقات سے سلوک میں آسانی:

سلوک بہت آسان ہو گیا۔ آپ ضرورت کے مطابق نیند پوری کریں، سات گھنٹے اچھی نیند ہے، اگر کوئی بہت تھکا ہوا ہو تو بے شک آٹھ گھنٹے سوئے۔ سات آٹھ گھنٹے سونا تصوف میں منع نہیں ہے، نیند پوری کریں، اور آٹھ گھنٹے جو دفتر کے ہیں وہ دفتر کو دیں،

ہم اس سے بھی منع نہیں کرتے۔ لیکن وہ جو باقی آٹھ گھنٹے بچتے ہیں، اب ان میں بیوی بچوں کے ساتھ آپ دو گھنٹے گزار لیں، کوئی ضروری خرید و فروخت کرنی ہے تو ایک گھنٹہ اور لگا لیں، لیکن وہ جو تین چار گھنٹے گزرتے ہیں کہ خبریں پڑھ رہا ہوں جی! اور خبروں کے نام پر سکرینیں کھل رہی ہوتی ہیں۔ شیطان بٹھاتا ہے کہ ذرا فلاں کی تقریر سنتا ہوں، وہ تقریر سننے بیٹھتے ہیں، تصویر دیکھ کر ختم کرتے ہیں۔ تقریر سے تصویر پر چلے جاتے ہیں، تصویریں دیکھ رہے ہوتے ہیں بیٹھے۔ تو یہ جو تین چار گھنٹے ہر بندے کی زندگی میں Optional (اختیاری) ہوتے ہیں، وہ فون پر گزرتے ہیں، اِدھر اُدھر کسی اور کام میں گزرتے ہیں، ان کو Manage (منظم) کریں، اگر ان کو اچھی طرح استعمال کر لیں تو آپ کا سلوک طے ہو سکتا ہے، کسی کے لیے رکاوٹ نہیں ہے۔ اس بات کو اس لیے تفصیل سے بتایا کہ پتا رہے کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟ تو کثرتِ ذکر اور اتباعِ سنت یہ ہماری بیماری کا حتمی علاج ہے۔

سلوک چلنے سے ہی طے ہوتا ہے:

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ یہ جو سلوک ہے یہ کوئی علم نہیں ہے کہ پڑھا دو تو سب کو پتا لگ جائے گا۔ یہ کیفیات کا نام ہے اور کیفیات کرنے سے ملتی ہیں، سننے سے نہیں مل جاتیں۔ اس لیے کہ سلوک کا مطلب ہے راستہ، اور راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ آپ یہاں سے بیٹھ کر مکہ مکرمہ کا تصور کر لیں تو مکہ مکرمہ تک پہنچ تو نہیں نہ جاتے، راستہ طے کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر دل میں چاہت ہو کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاؤں تو پہنچ تو نہیں جائیں گے، اس کے لیے راستہ طے کرنا پڑے گا۔

اب اس کے لیے ہمارے مشائخ نے یہ بتلایا کہ دیکھو! چھت پر اگر بندہ چڑھنا

چاہے تو سیڑھیاں ہوتی ہیں، سیڑھیوں پر چڑھتا جائے، چھت پر چلا جائے گا۔ جو ماسٹر کی ڈگری لینا چاہے تو سولہ سال کا ایک سلیبس ہوتا ہے، اسے پڑھ کر ماسٹرز کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہے تو پینتیس اسباق کا یہ سلیبس ہے، اگر وہ کر لے گا تو اللہ رب العزت کی معرفت نصیب ہو جائے گی۔ انہوں نے ہم پر یہ احسان کیا کہ اس کو کھول کھول کر بتا دیا کہ پہلے سبق پر تم یہ کرنا، یہ کیفیت ملے گی...... پھر یہ کرنا، یہ کیفیت ملے گی...... یہ کرنا تو یہ کیفیت ملے گی...... اب بتائیں کتنا آسان کر دیا انہوں نے اس راستے کو!! اب ایک بندہ دو سیڑھیاں چڑھ کر کھڑا ہی ہو جائے تو قصور تو کسی کا نہیں، اپنا ہی قصور ہے۔ آج یہی ہوتا ہے کہ ایک سبق کیا، دو سبق کیے اور دو سبق کے بعد بس کھڑے ہو گئے۔ اسی پر سال گزر گیا، دو سال گزر گئے۔ یہ بتائیں اگر کوئی طالب علم تیسری کلاس میں تین سال لگا دے، اسے پاس کہیں گے یا فیل کہیں گے؟ اسے فیل ہی کہیں گے۔ تو ہمیں آگے بڑھنا چاہیے، کوشش کرنی چاہیے۔

سلوک میں رکاوٹ اپنی سستی ہے:

اس میں رکاوٹ ہماری اپنی سستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں:

در طریقِ ما محرومی نیست

”ہمارے اس طریقے میں محرومی نہیں ہے۔“

وہ فرماتے ہیں کہ ”منزل تک پہنچنے میں سالک کی اپنی سستی کے سوا اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے“۔ خود ہی سست ہیں۔

ہمیں یاد آتا ہے کہ امریکہ میں بہت بڑے بڑے ہائی وے ہیں۔ وہاں پر بعض

ہائی وے ایسے ہیں کہ اس کوٹرن پائپ کہتے ہیں، یعنی آپ ہائی وے پر ایک دفعہ چڑھ گئے تو اس کا Exit (خروج) کہیں نہیں ہوتا، ایک منزل ہوتی ہے وہاں جا کر ایگزٹ آتا ہے، درمیان میں کہیں نہیں آتا۔ اس کوٹرن پائپ کہتے ہیں۔ ہمارا یہ سلوک بھی ٹرن پائپ کی طرح ہے۔ جو چڑھ گیا، اِدھر اُدھر کہیں نہیں جا سکتا۔ ہاں! یہی ہے کہ منزل پر اگر نہیں پہنچا تو اس کا مطلب ہے کہ درمیان میں کہیں کھڑا ہو گیا ہے۔ ورنہ آہستہ آہستہ بھی چلتا رہے، چلتا رہے تو پہنچ ہی جائے گا۔ ہمارے اس طریق میں منزل تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، سوائے اپنی سستی کے۔

دل کو ماسوا میں اُلجھنے سے بچائیں:

بھئی! ہم سستی سے توبہ کریں اور جن اعمال نے ہمیں سست بنایا ہوا ہے، ان اعمال کو چھوڑیں اور کہیں دل کو اُلجھایا ہوا ہے تو اس کو نکالیں۔

؎ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

آج کل تو ٹکڑے بھی بہت ہوتے ہیں، اس پر نظر پڑی تو ایک ٹکڑا اس کو دے دیا، اس پر نظر پڑی تو ایک ٹکڑا اس کو دے دیا۔ تو ہم اپنے آپ کو ماسوا میں اُلجھنے سے بچائیں۔

یہ جو Enter into the net (انٹرنیٹ) ہے، اس مصیبت سے بچیں۔ یہ بھی بڑی مصیبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو زندگی پُرسکون گزارنے کے لیے وائف بنائی تھی، شیطان نے جہنم میں لے جانے کے لیے وائی فائی بنا دیا۔ اس بیچاری وائف کا وقت بھی وائی فائی کو چلا جاتا ہے۔ اس مصیبت سے بچیں، پھر دیکھیں! کیفیات کیسے ملتی ہیں؟

سلوکِ نقشبند......اصلاح کا مجرب نسخہ:

مشائخِ نقشبند کا یہ سلوک کوئی نیا تجربہ نہیں ہے کہ آج کے دور میں ایک نیا تجربہ کرر ہے ہیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے ہمارے مشائخ پر کھولا، کروڑوں لوگوں کو انہوں نے اس راستے پر چلایا۔ خود بھی انہوں نے اللہ کی محبت پائی، کروڑوں بندوں کو بھی اللہ کی محبت نصیب ہوئی، ان کی پاکیزہ زندگی اس پر دلیل ہے۔ تو یہ Patent (مجرب) نسخہ ہے۔ سلوک کے بارے میں بار بار، بار بار اس لیے بتایا جارہا ہے کہ کم از کم ہمیں پتا تو ہو کہ ہم نے کرنا کیا ہے؟

لطائف کے اسباق کا ثمر......فتویٰ کی زندگی:

ہمارے سلوک کے جو پہلے سات سبق ہیں وہ لطائف کے اسباق کہلاتے ہیں۔ پانچ لطائف عالمِ امر کے اور دو عالمِ خلق کے۔ سارے لطائف کے ذکر کا ایک ہی جیسا اثر ہے۔ جیسے کسی عمارت کے Piller (ستون) ہوتے ہیں، اس پر عمارت بنتی ہے، یہ جو ہمارے سات لطائف آئے، یہ سات Pillers (ستون) ہیں جن پر ہماری روحانیت کی عمارت بنتی ہے۔ پلر مضبوط ہوں تو عمارت بلند بنتی ہے۔ جتنا ہم ان پر زیادہ محنت کریں گے لطائف اتنا زیادہ روشن ہوں گے، اتنا پھر آگے معرفت کی سیڑھیاں چڑھنا ہمارے لیے آسان ہوجائے گا۔ تو ان سات لطائف پر محنت کرنے سے انسان کو شریعت پر چلنا آسان ہوجاتا ہے۔ جب سالک بیعت ہوتا ہے تو شروع میں فسق و فجور کی زندگی ہوتی ہے۔ پہلے سات اسباق اس کی زندگی کو فتویٰ میں لے کر آجاتے ہیں۔ اب وہ کم از کم حرام کے دائرے سے بچ کر حلال کے دائرے میں آجاتا ہے۔

تہلیل کے اسباق کا ثمر......تقویٰ کی زندگی:

پھر سات اسباق کے بعد تہلیل کے اسباق ہیں، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا ورد کرنا۔ چاہے سانس روک کر کریں (تہلیلِ خفی)، چاہے زبان سے کریں (تہلیلِ لسانی)۔ان کی یہ برکت ہے کہ دل پر جھاڑو پھر جاتا ہے۔اِنْقِطَاع عَنِ الْمَخْلُوْق حاصل ہوجاتا ہے، دل میں کسی کا تعلق رہتا ہی نہیں ہے۔ ہرایک سے دل کٹ جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔تو یہ جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ہے، یوں سمجھیں کہ انسان کے دل کو پالش کردیتا ہے۔ جب کسی چیز کو پالش کرنا ہوتو پہلے اسے صاف کرتے ہیں پھر پالش کرتے ہیں۔تو کثرتِ ذکر نے دل کو صاف کردیا اور تہلیل نے اسے پالش کردیا، چمکا دیا۔اب اس میں کسی میل کا نام ونشان ہی نہیں۔یہی کیفیت انسان کے اس سبق کی ہے۔

قرآنِ مجید کی آیت ہے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾

''اوراپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو۔''

اب کوئی ہم سے پوچھے کہ تمہارے رب کا کیا نام ہے؟ تو ہم کیا بتائیں گے؟ ''اللہ'' اللہ کے سوا باقی نام تو صفاتی نام ہیں، ذاتی نام تو ''اللہ'' ہے۔تو ذکر کر اللہ کے نام کا۔نتیجہ کیا نکلے گا؟

﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○﴾ [المزمل:٨]

''اورسب سے الگ ہوکر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو۔''

یعنی مخلوق سے کٹو، اللہ سے جڑو۔تو ذکر کو اس درجے تک ہم نے پہنچانا ہے کہ مخلوق سے دل کٹ جائے اور اللہ سے دل جڑ جائے۔

جب تک دل ماسوا میں پھنسا ہوا ہے، اللہ کی معرفت اس پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ شرک پسند نہیں فرماتے۔ تھوڑا سا بھی دل میں کسی غیر کو جگہ دی ہوگی تو اللہ غنی ہیں، کہتے ہیں: جاؤ! جس کی محبت تم نے دل میں رکھی ہے، جاؤ اسی کو معبود بناؤ۔ اسی لیے جب کسی کو میسج لکھنے لگیں: I Love you تو یہ تین لفظ ہیں، ان کو لکھتے ہوئے تین دفعہ سوچا کریں۔ اگر تو دائرۂ شریعت کے اندر ہیں، پھر تو جائز ہے، بیوی کو لکھا، ماں کو لکھا، باپ کو لکھا، شیخ کو لکھا۔ اور اگر نفسانی، شیطانی اور شہوانی خواہشات کی وجہ سے لکھ رہے ہیں تو یہ تین لفظ لکھتے ہوئے ڈریں اور سوچیں کہ ایسا نہ ہو کہ میں کہہ رہا ہوں I Love you اور اللہ کہیں محبت تو تُو اس سے کرتا ہے، جاؤ میں نے تمہیں اسی کے حوالے کر دیا، اپنے چاہنے والوں کی فہرست سے میں نے تمہیں کاٹ دیا۔ اس لیے یہ تین لفظ لکھنا بندے پر پہاڑ کی طرح بھاری ہونے چاہییں۔ سوچ کر لکھے کہ کیوں لکھ رہا ہوں؟ اگر نفس کی خاطر لکھا تو اللہ کے چاہنے والوں میں سے نام کٹ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بڑے غیور ہیں، ایک غیر چہرے پر محبت کی نظر سے بیس سال کے بعد قرآنِ پاک سینے سے نکال دیا گیا۔ یہ اللہ کی غیرت کا معاملہ ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((أَتَعْجَبُونَ مِنْ غَيْرَةِ سَعْدٍ وَاللهِ لَأَنَا أَغْيَرُ مِنْهُ وَاللهُ أَغْيَرُ مِنِّي))

[صحیح بخاری، حدیث: ٦٨٤٦]

"تم سعد کی غیرت سے تعجب کرتے ہو؟ بخدا! میں ان سب سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیور ہے۔"

یہ جو دل کا کہیں پھنس جانا ہے، وہ ایسے ہی ہے کہ رسی سے آپ نے کسی جانور کو باندھ دیا تو وہ تو ہل ہی نہیں سکتا۔ آپ اگر کسی پرندے کو بیس فٹ دھاگے سے باندھ

دیں تو وہ بیچارا پرواز تو کرے گا لیکن بیس فٹ سے اوپر جا ہی نہیں سکتا۔ یہی ہمارا حال ہوتا ہے۔ ہم نے دل اِدھر اُدھر اٹکایا ہوا ہوتا ہے، بس وہ ایک تھوڑی سی ظاہر داری کی پرواز ہوتی ہے جو ہم کرتے ہیں، اس سے اوپر جا ہی نہیں سکتے۔ گرفتاری سے کھلیں گے تو آزادی سے سفر طے کریں گے۔ اس لیے اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے کہ دل کہیں نہ اٹکا ہوا ہو، کامل اللہ کو دینا ہے، پورا دل اللہ کو دینا ہے۔

......محبوبِ حقیقی اللہ ہے۔

......مشہودِ حقیقی اللہ ہے۔

......مطلوبِ حقیقی اللہ ہے۔

''خداوندا! مقصودِ مَن توئی ورضائے تو''

دل سے یہ آواز آنی چاہیے۔ اس کو کہتے ہیں ''بازگشت''۔ دل سے بندہ جو آواز سنتا ہے، اس کو بازگشت کہتے ہیں۔ تو ہمارے سلسلے میں بازگشت ہے:

''خداوندا! مقصودِ مَن توئی ورضائے تو، مرا محبت ومعرفت، ذوق وشوق خود بدہ''

''اے اللہ! میرا مقصود آپ اور آپ کی رضا ہے، مجھے اپنی محبت ومعرفت خود ہی عطا فرما دیجیے۔''

تو دل سے یہ آواز آئے۔

تیرے سوا محبوبِ حقیقی کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
تیرے سوا مقصودِ حقیقی کوئی نہیں ہے کوئی نہیں

دل کی ایسی کیفیت ہو!

یاد میں تیری سب کو بھلا دوں کوئی نہ مجھ کو یاد رہے
تجھ پر سب گھر بار لٹا دوں خانۂ دل آباد رہے

؎ سب خوشیوں کو آگ لگا دوں غم سے ترے دل شاد رہے
سب کو نظر سے اپنی گرا دوں تجھ سے فقط فریاد رہے

ایسی کیفیت ہوجائے!

تو لطائف کے اسباق کرنے سے انسان کبائر کو چھوڑ کر فتویٰ کی حدود میں آجاتا ہے اور تہلیل کا ذکر کرنے سے تقویٰ کی حدود میں آجاتا ہے۔ پھر انسان گناہ کے مواقع سے بھی بچتا ہے۔ دل کی کیفیت پھر ایسی ہوجاتی ہے کہ تقویٰ پر زندگی آجاتی ہے۔

مراقبۂ احدیت کا ثمر......مقامِ فنائیت:

اب جب ماسوا سے بھی ہٹ کٹ گئے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ کی محبت میں انسان کو ایک جذب کا مقام ملتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سلسلے کا جو دسواں سبق ہے ''مراقبۂ احدیت'' وہ فنائیت کا سبق ہے کہ انسان اللہ کی محبت میں گم ہوتا ہے، اس کی ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ اللہ اکبر کبیرا۔ ہر وقت اللہ کی طرف دھیان...... اللہ کی طرف یاد...... یہ فنا کی کیفیت عجیب ہے! حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

پنشن ہوگئی ہے کیا بات ہے اپنی
اب دن بھی ہے اپنا اور رات بھی اپنی
اب اور ہی کچھ ہے مرے دن رات کا عالم
ہر وقت ہی رہتا ہے ملاقات کا عالم

یہ جو فنائیت کی کیفیت ہے، اس میں پھر ''ہر وقت ہی رہتا ہے ملاقات کا عالم۔'' زندگی کے وہ لمحے کتنے اچھے ہوں گے کہ جس میں انسان کا دل ایک اللہ کی محبت سے بھرا ہو۔ تو ابھی تک ہمیں اللہ کی محبت کا وہ مزا نہیں آیا جو بندے کو بیگانہ کر دیتا ہے۔

؎ دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

ابھی وہ آشنائی کی لذت ہمیں نہیں ملی، تبھی تو دنیا سے ابھی ہم بیگانہ نہیں ہوئے۔ تو پہلے دس اسباق تک پہنچتے پہنچتے سالک کو اللہ کی محبت میں مستی کا مقام مل جاتا ہے، جذب کا مقام مل جاتا ہے اور اس میں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے۔ بس دل چاہتا ہے کہ مجھے کوئی نہ چھیڑے، میں اللہ کی یاد میں بیٹھا رہوں۔ راتوں میں اللہ کی یاد...... دن میں اللہ کی یاد۔

ایک نوجوان ہوسٹل میں رہتا تھا تو وہ روزانہ تین گھنٹے مراقبہ کرتا تھا اور مراقبے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھتا تھا اور دعا مانگتا تھا کہ یا اللہ! کوئی آ کر دروازہ نہ کھٹکھٹائے، کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ اللہ اکبر کبیرا!! یوں اللہ کی محبت میں وقت کا پتا بھی نہیں چلتا، ایسا لطف ملتا ہے۔

؎ رہوں بیٹھا میں اپنا سر جھکا کر
سرور ایسا عطا کر دل بدل دے

اس یاد میں ایسا سرور ہوتا ہے۔

؎ جایئے کس واسطے اے درد مے خانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے پیمانہ کے بیچ

ایک لطف اور مزا ہوتا ہے، جو اللہ والوں کو اللہ کی یاد سے ملتا ہے۔

تو یہ پہلے دس اسباق بندے کو ماسوا سے کاٹتے ہیں اور اللہ کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور انسان اللہ کی محبت میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر یہ کیفیت نہیں تو پھر اسباق کو نئے سرے سے کرنا چاہیے۔

کیسے پتا چلے کہ سبق طے ہوا یا نہیں؟

بعض اوقات مجازین یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیسے پتا چلے کہ اس کا یہ سبق طے ہوا یا نہیں؟ بھئی! آسان طریقہ ہے، اگر بیعت ہونے کے بعد اس کے اندر شہوات میں کمی آئی ہے، آنکھ کا پرہیز آ گیا ہے، غیر محرم سے تعلق چھوٹ گیا ہے، شریعت کے اوپر آ گیا ہے، ظاہر شریعت کے مطابق بن گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اب اس کے اندر لطیفۂ قلب کا اثر ہو رہا ہے، شہوت ختم ہو رہی ہے۔ اسی طرح

......غصہ کم ہو گیا تو لطیفۂ روح مکمل ہو گیا۔

......بخل ختم ہو گیا تو لطیفۂ سر طے ہو گیا۔

......حرص اور حسد نکل گیا تو لطیفۂ خفی طے ہو گیا۔

......اور خود نمائی، خود پسندی، عجب و تکبر نکل گیا تو لطیفہ اخفیٰ طے ہو گیا۔

تو ان بیماریوں سے بھی اندازہ لگ سکتا ہے کہ شفا ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اصل یہ دیکھیں کہ اب مخلوق سے کٹا اور اللہ سے جڑا ہے یا نہیں؟ اگر اسی طرح انٹرنیٹ پر بیٹھنا، میسج کرنا، فون کرنا اور انہی کاموں میں لگے رہنا، اس کے اندر ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی قلب نازیبا حرکتوں سے باز نہیں آیا، ابھی اس کو اللہ کی محبت کا مزا نہیں آیا۔ جب تک قلب نازیبا حرکتوں سے باز نہ آئے، اللہ کی محبت کا مزا اس پر حرام ہوتا ہے۔ تو دل کو غیر سے کاٹیے اور دل اللہ کا ہے، اللہ کو دیجیے۔

تہلیل اور مراقبۂ احدیت کا سبق کرنے سے زندگی میں تقویٰ اور ماسوا سے انقطاع آ جاتا ہے اور انسان کو اللہ کی محبت میں ایک استغراق کی کیفیت نصیب ہوتی ہے۔ کسی نے کسی اللہ والے سے پوچھا: حضرت! آپ کو نماز میں دنیا کا خیال آتا ہے؟

فرمایا: نہ نماز میں آتا ہے، نہ نماز کے علاوہ آتا ہے۔ ایسی کیفیت ہوجاتی ہے کہ بندے کا دل ہی دنیا سے اچاٹ ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بندہ اس سبق پر پہنچ کر دنیا کا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے، جاب چھوڑ دیتا ہے، بزنس چھوڑ دیتا ہے، ناں...... ناں...... ناں، وہ کچھ نہیں چھوڑتا، بس دل ٹھنڈا ہوجاتا ہے، دل کٹ جاتا ہے۔ اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے، وَالْاِنَابَةُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف انابت ہوجاتی ہے۔ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ اور موت کی تیاری میں لگا رہتا ہے۔

مشاربات کے اسباق کا ثمر......توکل اور یقینِ کامل:

اب جب یہ کیفیت حاصل ہوگئی تو اس کے بعد پھر اگلے اسباق ہیں جن کو مشاربات کے اسباق کہتے ہیں۔ ان کو کرنے سے انسان کو اللہ پر توکل اور یقینِ کامل مل جاتا ہے...... یہ لب لباب بتا رہا ہوں۔ ویسے تو ہر سبق کی اپنی اپنی تفصیل ہے، لیکن پورے اسباق کا ایک لب لباب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کامل یقین مل جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہیں۔ کائنات کا پورا نظام اللہ کے حکم سے چلتا ہے، بندے کو یہ یقین ہوجاتا ہے...... اس لیے ہر معاملے میں نظر اللہ پر ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں تو عزت کے نقشوں میں سے ذلت نکال دیتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں تو ذلت کے نقشوں میں سے عزت نکال دیتے ہیں۔ جب اللہ پر یقین ہوجاتا ہے تو پھر مخلوق سے شکوے ختم ہوجاتے ہیں کہ فلاں نے میرے بارے میں ایسے الفاظ کیوں کہے؟...... اگر کہے تو اللہ نے کہلوائے۔ فلاں جی میری ٹانگیں کھینچ رہا ہے...... وہ نہیں کھینچ رہا، اللہ کھنچوا رہے ہیں۔ اللہ پر نظر...... اللہ پر نظر......تو کسی سے شکوہ ہی نہیں رہتا۔ پھر بندے کی ایسی کیفیت ہوجاتی ہے:

﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ﴾

[الحدید:۲۳]

بندے کی کیفیت ''راضی برضا'' ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے امور کو اللہ کے سپرد کردیتا ہے، ہر معاملے میں اللہ پر توکل۔ پھر مخلوق کی مدح اور ذَم برابر ہوجاتی ہے۔ کوئی دین کے معاملے میں ملامت کرے تو اس سے خفا نہیں ہوتا، سمجھتا ہے کہ اللہ اس سے کہلوا رہے ہیں۔ کوئی بہت تعریفیں کرے تو انسان ہوا میں نہیں اُڑتا، سمجھتا ہے کہ اللہ اس سے کہلوا رہے ہیں۔ تو یہ یقین یہ ان اسباق میں آکر ملتا ہے۔

اور یہ ذہن میں رکھنا کہ جن کا یہ یقین جتنا پکا ہوگا، اتنا نسبت کا کام ان سے زیادہ بہتر لیا جائے گا، کیونکہ یہ عقل کے ذریعے چلنے والی چیز نہیں ہے۔ آپ عقل سے ایک کام کو پھیلا سکتے ہیں، دیکھو! دنیا میں کتنے کام ہیں جو پھیلے ہوئے ہیں، کتنی تحریکیں ہیں جو پھیلی ہوئی ہیں، مگر قبولیت تو نہیں ہے۔ عقل سے پھیلاؤ تو آسکتا ہے، گہراؤ نہیں آسکتا۔ گہراؤ آئے گا جب اندر قبولیت ہوگی، اور قبولیت ہوگی یقین کے اوپر۔ تو ان اسباق سے پھر سالک کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایک یقین کامل ہوجاتا ہے۔ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، ہر معاملے میں اللہ کی طرف خیال جاتا ہے۔

معیت کے اسباق کا ثمر......احسانی زندگی:

پھر اس کے بعد چند اسباق ہیں جن کو معیت اور اقربیت کے اسباق کہا جاتا ہے۔ ان اسباق میں جا کر پھر سالک کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقامِ احسان والی کیفیت مل جاتی ہے، معیت کی کیفیت مل جاتی ہے۔ تو بس سلوک کا خلاصہ یاد رکھیں کہ

......لطائف کے اسباق سے زندگی فتویٰ میں آجاتی ہے۔

......تہلیل کے اسباق سے زندگی تقویٰ میں آجاتی ہے۔

......مشاربات کے اسباق میں انسان میں توکل آجاتا ہے۔

......معیت کے اسباق میں انسان کو مقامِ احسان کی کیفیت مل جاتی ہے۔

اللہ کی معیت کا ہر وقت استحضار رہتا ہے، ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّكَ تَرَاهُ)) یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

ہمارے مشائخ نے کہا کہ ولایت کا سلوک یہاں تک طے ہو جاتا ہے۔ سلوک اس سے آگے بھی ہے۔ یہ تو سولہ سبق ہوئے، پینتیس اسباق تک سلوک ہے۔ مگر وہ کمالات کا سلوک ہے: کمالاتِ نبوت...... کمالاتِ رسالت...... کمالاتِ اولوالعزم۔ مراقباتِ حقائق ہیں: مراقبہ حقیقتِ قرآن...... مراقبہ حقیقتِ صلوٰۃ...... مراقبہ حقیقتِ کعبہ، یہ سب اونچے اسباق ہیں۔ لیکن وہ تو بعد کی بات ہے، کم از کم ہر بندے کو یہ جو پہلے پندرہ سولہ سبق ہیں یہاں تک تو پہنچنا چاہیے، تاکہ مقامِ احسان والی نمازیں پڑھنی نصیب ہو جائیں۔ کب تک ہم بے دھیانی کی نمازیں پڑھتے رہیں گے، بے ذوق اور بے سرور سجدے کرتے رہیں گے۔

احسان والی نماز:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں عجیب بات لکھی ہے، فرماتے ہیں: ہر مومن کو جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، رؤیتِ باری تعالیٰ نصیب ہوگی۔ مگر جنت میں رؤیت کی جو کیفیت ہوگی وہ دنیا میں نماز کی کیفیت کے مطابق ہوگی۔ پھر وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو دنیا میں ماسوا کے خیال کے بغیر نماز پڑھنی نصیب ہوگی، یکسوئی کے ساتھ نماز پڑھتے ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو بغیر کسی حائل اور پردے کے اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اور دنیا میں نماز پڑھتے ہوئے جتنے وساوس آئیں گے، اتنے ہی دیدار میں پردے آتے جائیں گے۔ ایک

ہوتا ہے پردے میں سے دلہن کو دیکھنا اور ایک ہے پردے کے بغیر دیکھنا، اب سوچیے کہ اگر ہم نے اپنی نمازوں کو وساوس کے بغیر نہ بنایا تو کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے اس پر محنت کرنی بہت ضروری ہے، تاکہ ہمیں بھی احسان والی نماز نصیب ہو جائے، ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) والی کیفیت نصیب ہو جائے۔ اللہ اکبر۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: اگر نماز نہ ہوتی تو اس دنیا میں ہمیں محبوب کا وصل کیسے ملتا؟ نماز ہی تو ہے جس سے دنیا میں محبوب کے وصل کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ سامنے ہی تو کھڑے ہیں۔ تو سلوک کا اصل مقصد یہ ہے کہ مقامِ احسان والی نماز کی کیفیت نصیب ہو جائے۔

......کوئی کرامات صادر ہونا مقصد نہیں ہے۔

......کوئی رنگ دیکھنا مقصد نہیں ہے۔

......دعائیں قبول ہونا مقصد نہیں ہے۔

......عزتیں ملنا مقصد نہیں ہے۔

......مقدمے فتح ہونا مقصد نہیں ہے۔

......فتوحات کے دروازے کھلنا مقصد نہیں ہے۔

کوئی مقصد نہیں ہے، ایک مقصد ہے کہ قلب کی ایسی کیفیت ہو جائے کہ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) جب تک یہ کیفیت نہ ملی، ہمیں پورے دین کی نعمت نہیں ملی۔ چونکہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((هٰذَا جِبْرِيلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِينَهُمْ)) [صحیح مسلم، حدیث:۱۰۶]

''یہ جبرئیل علیہ السلام تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

تو ''احسان'' دین کا حصہ ہے، اگر یہ حاصل نہیں ہوا تو دین کا ایک حصہ حاصل نہیں

ہوا۔ اگر کامل دین مل جائے، ہمیں احسان کی کیفیت مل جائے اور اس کیفیت کے ساتھ چند سجدے بھی ہم کر گئے تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نظر ہو گی۔

سلوک کے طے ہونے میں اصل رکاوٹ:

اب اس سلوک کے طے ہونے میں کوئی دوسری رکاوٹ نہیں ہے، ہمارا اپنا نفس رکاوٹ ہے۔ ہماری اپنی خواہشات ہیں اور ہمارے اپنے جذبات رکاوٹ ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے تو اللہ سے ایسا طریقہ مانگا جو بہت آسان ہے، اب اس پر چلنا ہمارا کام ہے۔ تو بھئی! اپنے معمولات کی پابندی کیجیے۔ ہمارے مشائخ نے لکھا ہے:

"مَنْ لَا وِرْدَ لَهٗ لَا وَارِدَ لَهٗ"

''جو ورد نہیں کرے گا، اس پر کوئی کیفیات نہیں آئیں گی۔''

حضرت سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ فرمانے لگے: ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کون بندہ ذکر کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ ہم ذہن میں سوچنے لگے کہ کشف ہوتا ہوگا۔ مگر وہ بڑے صاحبِ کشف تھے، فوراً کہنے لگے: یہ کشف نہیں ہوتا۔ دیکھو! جو ذکر کرے گا، یقیناً اس پر کیفیات ہوں گی اور جس پر کیفیات ہوں گی وہ لازماً شیخ سے رابطہ کرے گا۔ وہ ڈھونڈے گا...... چاہے دنیا کے دوسرے کونے پر بھی شیخ ہوں...... اس نے تو پوچھنا ہے۔ اور جس کا چھ چھ مہینے رابطہ ہی نہیں ہوتا، اس کا مطلب ہے کہ وہ کرتا ہی کچھ نہیں ہے۔ اور واقعی ہم نے دیکھا کہ جو مراقبہ کرتے ہیں، ان کی کیفیات ہوتی ہیں، اور وہ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ تو جہاں بھی شیخ ہوں گے ڈھونڈ کر کہتے ہیں کہ حضرت! مجھے اب کیا کرنا ہے؟ جب کیفیات ہوں گی تو بندہ ڈھونڈے گا۔

لطیفہ ہے کہ بہو کو اُمید تھی اور ولادت کے دن قریب تھے تو وہ ساس کو کہنے لگی:

اچھا! اب میں سو رہی ہوں، اگر ولادت کا معاملہ قریب آئے تو مجھے جگا دینا۔ اس نے جواب میں کہا: میں تجھے نہیں جگاؤں گی، تُو سارے محلے کو جگائے گی۔ تو جس کی ولادت ہونی ہوتی ہے، اس کو کوئی نہیں جگاتا، وہ سب کو جگاتی ہے۔ اسی طرح جب بندے پر کیفیات آتی ہیں تو وہ تو شیخ کو بتائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، چاہے میسج کرے، چاہے خط لکھے، چاہے کسی طرح پہنچے، وہ پہنچ کر ہی رہے گا۔ اور جس کا رابطہ ہی نہیں ہوتا، چار مہینے، چھ مہینے، ایک سال، اس کا مطلب ہے کہ ورد وظیفہ کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے اس کام میں رکاوٹ ہماری اپنی سستی ہے۔ اب یہ ذہن میں بٹھا لیجیے کہ ہم نے ذکر کی کثرت کرنی ہے اور سنت کی اتباع کرنی ہے اور جو کیفیات ہوں ان کو شیخ سے پوچھنا ہے۔ راستہ بڑا سیدھا سیدھا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی محبت عطا فرمائے۔

نسبت حاصل کرنے والے ہر زمانہ میں رہیں گے:

یہ نسبت قیامت تک چلتی رہے گی، ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اس نسبت کو پھیلانے کا بھی کام لیں گے اور نسبت کے طلب گار بھی ہر دور اور ہر زمانے میں رہیں گے۔ دنیا میں آج بھی لوگ ہیں جو یکسوئی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلق والے بعض لوگ جب اپنے حال احوال سناتے ہیں تو دل کو خوشی ہوتی ہے۔

۞ اب یہی رمضان گزرا تو کسی نے مشکل سے ایک قرآن ختم کیا ہوگا، کسی نے دو ختم کیے ہوں گے، ایک نوجوان نے خط لکھا کہ حضرت! الحمد للہ اس رمضان میں تیس مرتبہ قرآن پاک پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ روز ایک ختم، سبحان اللہ!!

۞ ہم سمجھتے ہیں کہ آدھا گھنٹہ مراقبہ بڑی چیز ہوتی ہے، الحمد للہ کسی نے مجھے میسج میں بتایا کہ آج کل چار گھنٹے روزانہ مراقبہ کرنے کا معمول ہے۔

☼ اسی طرح کسی کا دس ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ کا ذکر روزانہ کرنے کا معمول ہے، کسی کا بیس ہزار کرنے کا معمول ہے، کسی کا تیس ہزار مرتبہ معمول ہے، بلکہ ایک خاتون ہیں، اللہ کی بندی، روزانہ گھر میں چالیس ہزار مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا ذکر کرتی ہیں۔ روزانہ اتنی مرتبہ جو ذکر کرنے والے ہیں، وہ ہیں جو اپنے اوقات کو دین میں لگاتے ہیں۔

☼ ایک عالمہ نے مجھے میسج کیا: حضرت! آج چھٹی کا دن تھا، الحمدللہ! میں فجر کے بعد مراقبے میں بیٹھی، ظہر کی نماز کے وقت اُٹھی۔

تو فجر سے ظہر تک مراقبہ کرنے والے بھی لوگ موجود ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ جی ہم اگر نہیں کرتے تو سارے ہی نہیں کرتے، کرنے والے اللہ کے عاشق ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ تو بھئی! ہمیں بھی چاہیے کہ ہم آگے بڑھیں، اعمال کریں اور اللہ سے اللہ کو مانگیں، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ نعمت عطا فرما دے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

کامیابی کا راستہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○﴾
(الملک:۲)

سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

مال کا دھوکا:

ہر انسان کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہوجائیں۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ جس بندے کے پاس مال زیادہ ہے وہ اپنی مرضی کے ہر کام کو کر لیتا ہے، تو پھر وہ مال کمانے کے پیچھے پاگلوں کی طرح لگ جاتا ہے۔ خود بھی کمانے میں لگا رہتا ہے اور اپنی اولاد کو بھی اسی راستے پر لگا دیتا ہے۔ بزنس مین ہے تو اولاد کو بھی

بزنس کے ساتھ لگا لیتا ہے۔ فیکٹری کا مالک ہے تو اپنی اولاد کو بھی فیکٹری چلانے میں لگا لیتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں ان کو وہ مضامین پڑھاتا ہے جن سے بعد میں وہ اچھی جاب کر سکیں اور مال کما سکیں۔ حتیٰ کہ گھر کی عورتوں کو بھی ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ جاب کر سکیں اور پیسہ کما سکیں۔ الغرض کہ گھر کے ہر فرد کو مال کمانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تو وقت کے ساتھ ساتھ پیسہ کمانا گویا کہ بندے کا مقصد بن جاتا ہے، لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ مال زیادہ ہونے سے انسان کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔ کیونکہ

...... مال سے انسان کتاب تو خرید سکتا ہے، علم تو نہیں خرید سکتا۔

...... مال سے انسان دوائیں تو خرید سکتا ہے، صحت تو نہیں خرید سکتا۔

...... مال سے انسان اچھے کپڑے تو خرید سکتا ہے، خوبصورتی تو نہیں خرید سکتا۔

...... مال سے انسان دوسرے کی خوشامد تو خرید سکتا ہے، کسی کے دل کی محبت تو نہیں خرید سکتا۔

تو پیسے سے ہر چیز تو نہیں خریدی جاسکتی۔ اس لیے جن کے پاس پیسہ جتنا زیادہ ہوتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ وہ اتنا زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔

مال کا وبال:

مال آتا ہے تو اپنے ساتھ وبال بھی لے کر آتا ہے۔ کبھی اولاد نافرمان، کبھی بیوی نافرمان، کبھی صحت کی مشکلات، کبھی اور اسی قسم کے مسائل اور پھر دل بے چین رہتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ہمارے ایک ساتھی نے مجھے ایک Document (دستاویز) پرنٹ کر کے دی کہ دنیا کے بائیس تیئیس وہ بندے جو سب سے زیادہ امیر سمجھے جاتے

تھے، جو Millioner (کروڑ پتی) اور Billioner (ارب پتی) تھے، ان کا انجام کیسا ہوا؟ میں پڑھ کر حیران ہوا کہ ان بائیس تیئیس میں سے اٹھارہ نے تو خودکشی کی، سارے کے سارے ڈیپریشن کے مریض بنے، ان کو ہاسپٹل داخل کروایا گیا، ان کے ساتھ پاگلوں والا معاملہ کیا گیا۔ میں حیران تھا کہ ان لوگوں کے پاس مال و دولت کے اتنے خزانے ہیں، پھر کیوں پریشان ہیں؟ تو لکھا ہوا تھا کہ ان کے دل میں سکون نہیں تھا، پریشانی تھی۔ جو دنیا کے سب سے امیر لوگ ہوں ان کے دلوں میں ایسی پریشانی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سکون مال و دولت سے خریدنے والی چیز نہیں ہے۔

سکون اللہ کی یاد میں ہے:

یہ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ سکون حاصل کرنے کے لیے ہر وہ کام کرتے پھرتے ہیں جو انسان کو بے سکون بناتا ہے، یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ سکون ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نیکی کی زندگی گزارنے سے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ۝﴾ [الرعد:۲۸]

”یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔“

اللہ کے خزانے سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ:

آپ اگر غور کریں تو دنیا میں مختلف چیزوں سے نفع اٹھانے کے طریقے مختلف ہیں۔ پانی سے نفع اٹھانے کے طریقے اور ہیں، آگ سے نفع اٹھانے کے طریقے اور ہیں، ہوا سے نفع لینے کے طریقے اور ہیں، مٹی سے نفع لینے کے طریقے اور ہیں۔ جدا جدا طریقے ہیں۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے ہم اللہ تعالیٰ کی ذات سے فائدہ اٹھانے والے بن جائیں؟ اللہ کے خزانوں سے فائدہ

اٹھانے والے بن جائیں۔ اس کو سمجھانے کے لیے ہمارے آقا اور سردار حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔ انہوں نے آ کر یہ بات سمجھائی کہ لوگو! اگر تم میرے نقشِ قدم پر چلو گے تو اللہ کے خزانوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے بن جاؤ گے اور اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو نقصان پانے والے بن جاؤ گے۔ فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْعِزَّ وَ الْوَقَارَ لِمَنْ تَابَعَ اَمْرِیْ))
''جس بندے نے میرے حکم کی فرمانبرداری کی، اللہ نے اس کے لیے عزت و وقار کو لکھ دیا۔''

((وَ جَعَلَ الذِّلَّةَ وَ الصَّغَارَ عَلٰی مَنْ خَالَفَ اَمْرِیْ))
''اور جس نے میرے حکم کی مخالفت کی، اللہ نے اس کے لیے ذلت اور صغار (چھوٹا پن) کو لکھ دیا ہے۔''

کامیابی کا راستہ:

تو دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ جس راستے پر اللہ کے پیارے حبیب ﷺ چلے اور انہوں نے ہمیں اس راستے پر چلنے کا حکم عطا فرمایا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ کامیابی کا راستہ نہیں ہے۔ آج دنیا ٹھوکریں کھا رہی ہے، کوششوں میں لگی ہوئی ہے، لیکن مال و دولت سمیٹنے کے باوجود پریشان ہے۔ آپ جس بندے سے بات کر کے دیکھ لیں، آپ کو وہی بندہ پریشان نظر آئے گا۔ پریشانیاں بتانی شروع کرتے ہیں تو اللہ کی شان کہ پریشانیاں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ سنتے چلے جائیں ...... سنتے چلے جائیں ...... اتنی لمبی حکایتیں ہوتی ہیں کہ بندہ سن کر تنگ آ جاتا ہے۔

ایسا طریقہ کہ جس سے ہماری دعائیں قبول ہوں، ہماری نیک مرادیں پوری ہوں، ہمیں دنیا میں عزت ملے اور لوگوں سے محبت ملے، وہ طریقہ نبی علیہ السلام کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ وہ طریقہ نیکوکاری کی زندگی اختیار کرنے کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ [الاعراف:۹۶]

''اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔''

برکتوں کے دروازے کھل سکتے ہیں، مگر ان کو ہمارے گناہوں نے روکا ہوا ہے۔

رحمت الٰہی کا آف بٹن:

ہم لوگ ایک مرتبہ ایک کمرے میں تھے، گرمی بہت تھی، ایک بچہ بار بار پنکھے کا بٹن بند کر دیتا تھا جس کی وجہ سے گرمی اور زیادہ ہو جاتی تھی۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس دن مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمارے لیے عزت اور رزق کے دروازوں کو بنایا ہے، ہم گناہوں کے ذریعے سے اس کے آف بٹن کو دبا دیتے ہیں اور وہ دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر بجائے رزق میں انسان کو سکون ملنے کے اُلٹا پریشانی ملتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ [طٰہٰ:۱۲۴]

''اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی۔''

زندگی کو تنگ کرنے کا کیا مطلب؟...... اس کا مطلب یہ ہے کہ پریشان ہی

رہے گا روزی کی طرف سے۔

بڑے کاروباریوں کی بڑی پریشانیاں:

آپ دیکھیں کہ یہ بڑے بڑے جو کاروباری لوگ ہوتے ہیں، یہ زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ کیسے......؟ کہتے ہیں: جی! دو کنٹینرز وہاں بھیجنے تھے، وہ رک گئے...... ایک کنٹینر یہاں بھیجنا تھا، وہ رک گیا...... فلاں کام ایسے نہیں ہوا...... فلاں کام ویسے نہیں ہوا...... ان کے پیسے پھنسے ہی رہتے ہیں۔ فلاں نے اتنے پیسے دینے تھے، وہ دے نہیں رہا۔ تو پیسے کے پیچھے پریشان ہی ہوتے ہیں۔

اور کئی مرتبہ شیطان Expansion (توسیع) کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ اچھی بھلی زندگی تھی، چل رہے تھے، مزے کی زندگی گزار رہے تھے۔ ذہن میں خیال آیا کہ ہم فیکٹری کی Capacity کو بڑھالیں۔ اب Capacity بڑھانے کے لیے کبھی تو بینک سے Loan (قرض) لیا، کبھی لوگوں سے قرض لیے۔ اب یہ قرض ایسے چڑھ گئے کہ ان کو واپس نہیں کر سکتے، تو پریشانی ہی پریشانی۔ پیسہ تو ہے لیکن ساتھ پریشانی بھی ہے۔ پھر آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں کہ ہمارے پاس لیکویڈٹی نہیں ہے، اس لیے پریشانی زیادہ ہوگئی ہے۔ پیسہ ہوتا ہے بینکوں میں ہوتا ہے، پیسہ ہوتا ہے کاغذوں میں ہوتا ہے، ان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اللہ ان کی معیشت کو تنگ کر دیتے ہیں، لہٰذا ہر وقت پریشان ہوتے ہیں۔

عزت وسکون نیکی میں ہے:

وہ طریقہ جس سے کہ انسان کو دنیا میں عزت ملے، چین ملے، سکون ملے، وہ نیکی کا راستہ ہے۔ جن لوگوں نے نیکی کے راستے کو اپنایا، اللہ رب العزت نے دنیا کو ان کے

قدموں میں لا کر ڈال دیا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بندے نے کہا ہوا تھا: حضرت! میں آپ کو روزانہ ایک سوٹ سلوا کر دوں گا، آپ وہ پہن کر درس دیا کرنا۔ تو حضرت روزانہ نیا سوٹ پہن کر درس دیتے تھے۔ پرانے سوٹ کو اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیتے تھے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ ہے کوئی دنیا میں ایسا بزنس مین، کوئی امیر آدمی، جو یہ بتائے کہ میں سال میں ۳۶۵ سوٹ نئے بدلتا ہوں۔ بڑے سے بڑا امیر آدمی بھی ایک درجن دو درجن کپڑے بدل لے گا۔ وہی دھو دھو کر پہنتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ امیر کہلاتے ہیں، وزیر کہلاتے ہیں۔ اور جن کو ہم فقیر کہتے ہیں، اللہ ان کو سال میں ۳۶۵ سوٹ نئے بدلواتا ہے۔

مصلّے کی بادشاہی:

یہ جو مصلّے کی بادشاہی ہے، یہ عجیب نعمت ہے! انسان دیکھنے میں فقیر ہوتا ہے لیکن حقیقت میں امیر وہی ہوتا ہے، وہ دلوں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ دنیا کے بادشاہ تو جسموں کے بادشاہ ہوتے ہیں اور یہ اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اصل حکومت تو ان کی ہوتی ہے اور وہ ان کو نیکی کی وجہ سے ملتی ہے۔ ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں کہ جو بچہ ماں باپ کی بات مانتا ہو، پڑھائی شوق سے کرتا ہو، ماں باپ کی عزتوں کا سبب بنتا ہو تو ماں باپ اسے پیار کرتے ہیں۔ وہ بچہ کوئی فرمائش کرے کہ مجھے فلاں چیز چاہیے تو ماں باپ آدھی بات سنتے ہی اس کی بات کو پورا کر دیتے ہیں۔ اور جو بچہ ضدی ہو، بہانے باز ہو، کام چور ہو، ماں باپ کا دل دکھائے، وہ اگر کہے بھی کہ مجھے فلاں چیز چاہیے تو ماں باپ سنی اَن سنی کر دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جو بندہ اللہ رب العزت کی فرمانبرداری کرتا ہے، وہ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اللہ اس کی مراد پوری فرما دیتے

ہیں۔ اور جو انسان گناہوں بھری زندگی گزارتا ہے، وہ ہاتھ اُٹھا کر پھر جتنی مرضی دعائیں مانگتا رہے، اللہ تعالیٰ اس کی دعاؤں کو سُنا اَن سُنا کر دیتے ہیں۔

گویا جس نے نیکی کی اور نیکی کی زندگی کو اختیار کیا، اللہ تعالیٰ اپنے خزانوں کے دروازے اس کے لیے کھول دیتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ والوں کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی جیب میں ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے خزانوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیتا ہے۔

دنیا سے رخ موڑ لیں تو دنیا پیچھے آتی ہے:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک بندہ آیا اور اس نے کچھ ہدیہ پیش کیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ اگر کوئی بندہ سنت کی نیت سے ہدیہ پیش کرتا تھا تو قبول کر لیتے تھے اور اگر کوئی غریب سمجھ کر ہدیہ دیتا تھا تو پھر نہیں لیتے تھے۔ ان کی طبیعت کے اندر استغنا تھا۔ اس نے کوئی بات ایسی کر دی کہ جس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑے محتاج اور فقیر ہیں، ضرورت مند ہیں، لہٰذا میں ان کو دے رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا: میں آپ کا ہدیہ نہیں لوں گا۔ وہ بڑی منت کرتا رہا، لیکن حضرت نے نہ کر دی۔ واپس گھر جانے لگا تو اس کے دل میں خیال آیا: میں تو حضرت کے لیے ہدیہ لے کر آیا ہوں، حضرت نے قبول نہیں کیا تو کیا کروں؟ اللہ کی شان کہ جب وہ دروازے کے قریب جوتوں والی جگہ پر پہنچا تو اس نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جوتے پڑے ہوئے دیکھے، اس نے وہ چاندی کے سکے حضرت کے جوتوں کے اندر ڈال دیے۔ حضرت تھوڑی دیر بعد جب گھر تشریف لے جانے کے لیے اپنے جوتے پہننے لگے تو پتا چلا کہ جوتے کے اندر پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ نکالے تو پتا چلا کہ یہ وہی

پیسے تھے جو بندہ ہدیہ دینا چاہتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے: دیکھو! جو دنیا کو ٹھوکر لگاتا ہے، اللہ تعالیٰ دنیا اس کے قدموں میں یوں لا کر ڈال دیتے ہیں۔

اگر ہم دنیا کے پیچھے بھاگیں گے تو دنیا کبھی ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ لیکن اگر ہم دنیا سے رخ پھیر کر اللہ کو اپنا مقصود بنائیں گے تو یہ دنیا خود بخود ہمارے پیچھے آتی جائے گی۔ اس لیے زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان نیکی کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کے کاموں کو سنوارتے ہیں، اس کے کاموں میں اس کی مدد فرماتے ہیں۔ لوگوں کے دل میں اس بندے کی محبت، قدر اور عزت ڈال دیتے ہیں۔ یہی زندگی کو گزارنے کا بہترین طریقہ ہے۔

خواہشاتِ نفس کے توڑنے سے خواہشات کا پورا ہونا:

کتنی عجیب بات ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کو توڑنے میں خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ ظاہر میں تو انسان سمجھتا ہے کہ مجھے خواہشات کے خلاف کرنا پڑے گا۔ ہاں! ہمیں اپنی خواہشات کے خلاف کرنا پڑے گا لیکن اللہ ہماری خواہشات کو پورا کر دیں گے۔ ہمارے مشائخ نے اس کو کہا ہے "مقامِ تسخیر"۔ جب کسی بندے کو یہ مقام نصیب ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے عزتوں اور رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔

٭...... شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ دیکھنے میں ایک درویش آدمی تھے، مگر ان کو اتنے ہدیے ملتے تھے کہ ان کے دسترخوان پر کئی کئی ہزار آدمی ایک وقت میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ جب نبی علیہ السلام کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے تھے تو دو ہزار، پانچ ہزار، دس ہزار ریال پہلے صدقہ کرتے تھے، پھر سلام کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اور جب کبھی بیرون ملک سے چکر لگا کر واپس سلام کے لیے جاتے تھے

توسلام سے پہلے پچاس ہزار ریال صدقہ کرتے تھے، پھر سلام کے لیے جاتے تھے۔ آج بتائیں کہ کون اتنا امیر آدمی ہے کہ وہ پہلے پچاس ہزار ریال صدقہ کرے اور پھر نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو۔ اللہ تعالیٰ یوں راستے کھول دیتے ہیں۔

۞......حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مال کے دروازے اتنے کھول دیے تھے کہ جب مالِ غنیمت آتا تھا تو سونے چاندی کا ڈھیر لگتا تھا۔ اس ڈھیر کے پیچھے لوگ کھڑے ہوئے نظ نہیں آتے تھے، چھپ جایا کرتے تھے۔ اب بتائیں کہ وہ کتنا بڑا ڈھیر ہوگا کہ جس کے پیچھے کھڑا ہوا بندہ چھپ جاتا تھا۔

۞......حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر ایک وقت میں ساٹھ ہزار لوگ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب بتائیں! یہاں کے تو امیر لوگوں کی شادیوں پر ساٹھ ہزار لوگ کھانا نہیں کھاتے، حالانکہ زندگی میں ایک آدھ مرتبہ بچوں کی شادی کا معاملہ پیش آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر ایک وقت میں ساٹھ ہزار بندے کھانا کھاتے تھے۔ یہ دولت اللہ نے کہاں سے دی تھی؟ اللہ نے رزق کی برکت دی تھی۔

۞......ایک بدو تھا۔ اس کے دسترخوان پر ہر روز چار اونٹ ذبح ہوتے تھے۔ آپ بتائیں! کوئی ایسا بندہ ہے کہ جس کے گھر میں روزانہ چار بکرے ذبح ہوتے ہیں۔ کروڑ پتی لوگوں کے گھر میں بھی یہ کیفیت نہیں ہے کہ اتنے مہمان ہوں کہ چار بکرے ذبح ہوتے ہوں اور وہ ایک بدو تھا جس کے گھر میں اتنے لوگ اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے کہ چار اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دنیا سے منہ موڑا اور اپنے رب کو منایا، اللہ نے دنیا کو ان کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔

۞......حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دو لاکھ درہم ہدیہ میں بھیجے۔ انہوں ایک رات میں سارے کے سارے اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیے۔ سیدہ

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو پچاس ہزار درہم بھیجے۔ انہوں نے اسی وقت مدینہ کی بیواؤں کو بلوا لیا اور سب پیسے صدقہ کر دیے۔ باندی آئی کہ جی! آپ روزے سے ہیں اور افطاری کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ فرمانے لگیں: تو مجھے پہلے بتا دیتی، میں نے تو اب سب صدقہ کر دیا ہے، میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا۔

۞...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُمّ المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو پچاس ہزار درہم بھیجے۔ جیسے ہی پیسے ان کے پاس آئے، انہوں نے اسی وقت سارے کے سارے اللہ کے راستے میں تقسیم کر دیے۔ جب پورا مال تقسیم ہو گیا تو انہوں نے دو رکعت نفل پڑھے اور نفل پڑھ کر دعا مانگی: اے اللہ! امیر المومنین عمر ابن خطاب کو توفیق ہی نہ دے کہ وہ آئندہ مجھے پیسے بھیجا کریں۔ تو اس راستے پر اللہ تعالیٰ دنیا کو قدموں میں لا کر ڈال دیتے ہیں۔

۞...... ہمارے حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح دنیا کے دروازے کھول دیے تھے کہ اگر وہ چاہتے کہ مسجد کی دیواریں ایسی بنائیں کہ ایک اینٹ سونے کی ہو اور ایک چاندی کی ہو، تو مجھے پکا یقین تھا کہ حضرت ایسی مسجد بھی بنا جاتے۔ حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ خانیوال والے، انہوں نے مسجد بنائی تو لوگوں نے مسجد کا نام رکھ دیا "بے چندہ مسجد"۔ یہ نام کیوں رکھا کہ کبھی چندہ ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر انسان نیکی کی زندگی کو اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ یوں دنیا کے اندر فتوحات دے دیتے ہیں۔ پھر لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ محبتیں بھی ڈال دیتے ہیں اور عزتیں بھی ڈال دیتے ہیں۔

عالمِ اصغر اور عالمِ اکبر میں مطابقت:

اس کا اصول سمجھ لیں کہ انسان کائناتِ اصغر ہے، یعنی ایک چھوٹی کائنات ہے اور یہ جو ہمارے اِرد گرد کائنات ہے، یہ کائناتِ اکبر ہے، یعنی بڑی کائنات ہے۔ ان

دونوں کی چیزیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔مثال کے طور پر:

❁......انسان کے جسم پر بال ہوتے ہیں اور کائنات کے اندر دیکھیں تو زمین کے اوپر درخت ہوتے ہیں۔

❁......انسان کے جسم میں ہڈیاں ہوتی ہیں اور اگر کائنات کو دیکھیں تو اس میں پہاڑ اور پتھر ہوتے ہیں۔

❁......انسان کے جسم میں خون کی شریانیں ہوتی ہیں اور زمین کے اندر دریا اور نہریں ہوتی ہیں۔

❁......زمین کے اوپر چشمے ہوتے ہیں اور انسان کے جسم میں چشم ہوتی ہے۔ وقت آنے پر اس چشم میں سے بھی چشمے کی طرح پانی نکلتا ہے۔آنکھ سے آنسو ٹپکتے ہیں۔

❁......زمین کے اندر نرم مٹی ہوتی ہے، انسان کے اندر نرم گوشت ہوتا ہے۔

توجسم کی مشابہت ہے کائنات کے ساتھ۔ یہ عالمِ اصغر ہے، وہ عالمِ اکبر ہے۔

عالمِ اصغر کا حکم عالمِ اکبر پر:

اب دستور یہ ہے کہ جس بندے کے جسم پر اللہ کا حکم چلنا شروع ہو جاتا ہے، اس بندے کا حکم عالمِ اکبر پر چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو بندہ بھی اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارے گا، اللہ تعالیٰ اس کو مقامِ تسخیر عطا فرمائیں گے۔ جو لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، وہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس میں اصل رکاوٹ ہمارے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں جی پھوپھو نے پریشان کیا ہوا ہے، چچا نے پریشان کیا ہوا ہے، کسی کاروباری دوست نے پریشان کیا ہوا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کسی نے پریشان نہیں کیا ہوا، ہمیں ہمارے اپنے نفس نے پریشان کیا ہوا ہے۔سب سے بڑا دشمن ہمارا نفس ہے اور یہ نفس:

''اَخْبَثُ مِنْ سَبْعِیْنَ شَیْطَانًا''

یہ ستر شیطانوں سے زیادہ خبیث ہوتا ہے۔''

ہمارے راستے تو نفس نے بند کیے ہوئے ہیں۔ رزق کے دروازے...... عزتوں کے دروازے...... دعاؤں کے دروازے...... اس نے بند کیے ہوئے ہیں۔ اگر نفس نفس مطمئنہ بن جائے اور گناہ کرنا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ رزق کے دروازے کھولنے کے لیے تیار ہیں۔

مستجاب الدعوات بننے کا نسخہ:

ہمیں اس بات پر محنت کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے جسم سے گناہ سرزد نہ ہو۔ آنکھ سے گناہ نہ ہو، زبان سے، کان سے، دل دماغ سے، ہاتھ پاؤں سے، شرمگاہ سے، جسم کے کسی عضو سے گناہ سرزد نہ ہو۔ اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ جو بندہ ایسا بن جاتا ہے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے، وہ اللہ کی نظر میں مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔

حضرت بابو جی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ اس عاجز نے پوچھا: حضرت! آپ مستجاب الدعوات ہیں، اللہ نے آپ کو یہ مقام کیسے عطا فرمایا؟ انہوں نے میری بات سن کر کہا: ''میں اپنے سردار کی نافرمانی نہیں کرتا'' ...... وہ نبی علیہ السلام کو ادب سے اپنا آقا اور اپنا سردار کہا کرتے تھے...... تو فرمانے لگے: ذوالفقار! میں اپنے سردار کی نافرمانی نہیں کرتا، اس وجہ سے اللہ نے مجھے مستجاب الدعوات بنا دیا ہے۔ ہم بھی اگر نافرمانی چھوڑ دیں تو ہم بھی مستجاب الدعوات بن سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام:

دھوکا یہ لگتا ہے کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ فوری

طور پر کوئی تھپڑ تو نہیں لگتا کہ اِدھر بدنظری کی، اُدھر تھپڑ پڑ گیا۔ تو فوری طور پر کچھ ہوتا نظر نہیں آتا، تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ مگر اللہ کا نظام ایسا فول پروف ہے کہ جیسے ہی گناہ سرزد ہوتا ہے، اس کے بداثرات ضرور انسان پر ظاہر ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ 'ذرہ کے برابر'' نیکی کی اس کو بھی اجر ملے گا اور ذرہ کے برابر بُرائی کی تو اس کی سزا بھی اس کو ملے گی، تو اللہ کا نظام اتنا ایکوریٹ ہے کہ ایک ذرہ کے برابر نیکی کریں گے تو اس کا بھی اثر پہنچ کر رہے گا۔

اور اس سے ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو دنیا دار کہلاتے ہیں۔ وہ ہر وقت دنیا کمانے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ان کا دین سے اتنا دلچسپی کا معاملہ نہیں ہوتا، ہم ان کی بات نہیں کرتے، ہم بات کرتے ہیں ان کی جو دین دار کہے جاتے ہیں، جو دین دار سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بہت سارے گناہوں سے بچتے ہیں لیکن سو فیصد گناہوں سے وہ بھی نہیں بچ پاتے۔ کسی کو غصے کی بیماری...... کسی کو شہوت کی بیماری...... کسی کو حسد کی بیماری...... کسی کو عجب کی بیماری۔ وہ بیچارے بھی بیمار ہوتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ ظاہر تو ہمارا دین والا ہوتا ہے، مگر اللہ کی وہ مدد ساتھ نہیں ہوتی جو اس بندے کے ساتھ ہوتی ہے جو گناہوں سے بچتا ہے۔ پھر ہم بھی پریشانیوں کی زندگی گزارتے پھرتے ہیں۔ وہ طریقہ جس سے کہ اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام انسان کا مددگار بن جائے، وہ ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان گناہوں کو چھوڑ دے۔

کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے:

یہ کہنے میں جتنا آسان ہے کرنے میں اتنا ہی مشکل ہے۔ گناہوں کو چھوڑنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوتا، نفس انسان کو گناہ چھوڑنے نہیں دیتا۔ ایک نوجوان آیا، کہنے لگا:

حضرت! کیا کریں، بدنظری نہیں چھوٹتی؟ میں نے کہا: بھئی! اللہ کا خوف اگر دل میں ہوگا، پھر تو بدنظری چھوٹ جائے گی اور اگر دل میں اللہ کا خوف نہیں ہوگا تو کیسے چھوٹے گی؟ پھر میں نے ان کو ایک طریقہ سکھایا کہ دیکھیں! آپ چاہتے ہیں کہ کسی غیر محرم کی طرف دیکھیں اور اس وقت اس لڑکی کا خاوند آپ کی طرف دیکھ رہا ہو، یا باپ آپ کی طرف دیکھ رہا ہو، تو کیا اس وقت بُری نظر اُٹھا کر لڑکی کو دیکھیں گے؟ کہنے لگے: نہیں جی، اگر خاوند پاس ہوگا تو وہ تو میرے ساتھ جھگڑا کرے گا، لڑائی کرے گا اور ہوسکتا ہے مجھے ایذا پہنچائے، اس لیے اس حال میں، میں تو اس کی بیوی کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ میں نے اس بات پر جب ان کو اچھی طرح پکا کرلیا تو پھر انہیں یہ بات سمجھائی کہ دیکھیں! ہمارے اکابر نے یہ لکھا ہے کہ جب کوئی بندہ بدنظری کرتا ہے تو اس کی نظر اس عورت پر بعد میں پڑتی ہے، اس سے پہلے اللہ کی نظر اس بندے پر پڑ رہی ہوتی ہے۔ اللہ بندے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اچھا! تم ادھر بھی دیکھ رہے ہو للچائی نظروں سے، اس کو بھی دیکھ رہے ہو۔ ہماری ان بداعمالیوں کا وبال ہمیں پھر بھگتنا پڑتا ہے۔

؎ جو کرتا ہے تو چھپ کر اہلِ جہاں سے
کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اللہ تعالیٰ تجھے آسمان سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم دنیا کے لوگوں سے چھپ جاتے ہیں، اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ چنانچہ ان گناہوں کی وجہ سے آج ہم پریشانیوں کی زندگی گزارتے ہیں۔

بہترین عمل کیا ہے؟

اگر ہم چاہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کی زندگی عطا فرمائے، ہماری دعائیں قبول

فرمائے، ہمارے کاموں کو سنوار دے، ہمیں دنیا میں عزتیں دے، محبت دے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم نیکی کو بھاگ بھاگ کر کریں اور گناہوں سے اپنی جان چھڑائیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا کہ

﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملک:۲]

''تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔''

تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اَحْسَنُ عَمَلًا (بہترین عمل کمانا) کیا ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ ایسا بندہ اَسْرَعُ بِالْخَيْرِ نیکی کا کام کرنے میں جلدی کرے۔ بھاگ بھاگ کر نیکی کرے۔ وَاَوْرَعُ مِنَ الْمَعْصِيَةِ اور معصیت سے بچنے میں دوسروں سے زیادہ جلدی کرے، ایسا بندہ احسن اعمال کرنے والا ہوتا ہے۔

شیر کی فرمانبرداری:

صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مخلوق ان کی فرمانبرداری کرتی تھی۔ جنگل کے جانور بھی ان کی فرمانبرداری کرتے تھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ لشکر سے پیچھے رہ گئے۔ ان کو سمجھ نہیں لگ رہی تھی کہ لشکر کدھر گیا۔ بڑی مشکل پیش آ رہی تھی کہ دائیں جائیں یا بائیں، آگے یا پیچھے، آخر کدھر جائیں؟ اتنے میں ان کو ایک شیر نظر آیا۔ انہوں نے شیر کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہیں انسانوں کی مہک جلدی محسوس ہو جاتی ہے، مجھے پتا نہیں چل رہا، تو مجھے میرے لشکر تک پہنچا کر آ۔ شیر نے اپنی دُم ہلائی اور یہ صحابی شیر کی پیٹھ کے اوپر بیٹھ گئے۔ جیسے گدھا اپنے سوار کو لے کر پہنچاتا ہے، اسی طرح شیر نے ان کو ان کے لشکر تک پہنچا دیا اور واپس چلا گیا۔ ہم اللہ کی فرمانبرداری کریں گے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مخلوق کو ہمارا

فرمانبردار بنا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ رزق کے خزانوں کے دروازے بندے کے لیے کھول دیتے ہیں۔

زرِ تعاون لینے سے انکار:

حضرت مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بہت سے لوگ اپنا زکوٰۃ کا پیسہ لے کر آتے تھے تو حضرت ان کو فرماتے تھے: دیکھو بھئی! میرے مدرسے میں سالانہ جتنا خرچہ ہوتا ہے وہ تو پہلے ہی مجھے مل چکا ہے، اب میں آپ کے مال کو لے کر کیا کروں گا؟ تو حضرت ان کے مال کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ حضرت پورے سال میں کسی سے مال نہیں لیتے تھے، صرف رمضان میں لیا کرتے تھے، اور پھر ایک ایسا وقت بھی ان کی زندگی میں آیا کہ رمضان کے صرف آخری دس دنوں میں مدرسہ کے لیے پیسے لیتے تھے بس۔

ایک بندہ رمضان کے آخری دن کچھ رقم لے کر آیا کہ حضرت! مجھ سے یہ آپ اپنے ادارے کے لیے لے لیجیے، فرمایا: دیکھو بھئی! جتنا سال کا خرچہ ہے وہ تو پہلے سے میرے پاس موجود ہے اور جو فالتو پیسے ہیں، وہ مجھے پنجاب کے مدارس میں بھجوانے ہیں تو بجائے اس کے کہ میں یہ بھجوانے کی تکلیف اُٹھاؤں آپ خود ہی ان کو وہاں بھجوا دیں، اللہ آپ کو اجر عطا فرمائیں گے۔ آج مدرسے بنانے والے پریشان ہوتے ہیں کہ جی کوئی تعاون کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ ایسے ایسے معاونین بنا دیتے ہیں کہ جو بندے کے سارے خرچوں کو خود اُٹھا لیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہوتی ہے بندے پر۔

دنیا ہی میں جنت:

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتے ہیں:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمٰن:۴۶]

''اور جو شخص (دنیا میں) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا تھا، اس کے لیے دو باغ ہوں گے۔ (جنتیں)''

مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں دو محل عطا فرمائیں گے۔ جیسے ایک بندے کا ایک گھر لاہور میں ہے اور دوسرا اسلام آباد میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نیک بندے کے جنت میں دو گھر بنا دیں گے۔ اور بعض مفسرین نے لکھا کہ اس کا یہ معنی نہیں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ

''اَیْ جَنَّةُ الدُّنْیَا وَ جَنَّةُ الْاٰخِرَةِ''

آخرت میں تو اسے اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے ہی سہی، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کی زندگی کو بھی جنت کا نمونہ بنا دیں گے۔ اللہ والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر کے آخری حصہ میں منشا ایسی پوری فرماتے ہیں کہ جیسے جنت میں کسی کی منشا پوری ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ میں حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میں گیا اور کہا: حضرت! یہ جو مستجاب الدعوات ہونا ہے، یہ بہت بڑا انعام ہے اللہ رب العزت کی طرف سے۔ تو حضرت مجھے فرمانے لگے: ایک مقام اس سے بھی اونچا ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ وہ کون سا ہے؟ فرمانے لگے: ایک ایسا بھی مقام آتا ہے کہ جہاں بندے کو ہاتھ اُٹھانے بھی نہیں پڑتے، اللہ دل میں پیدا ہونے والی چاہت کو ہی پورا کر دیا کرتے ہیں۔ ہاتھ اُٹھانے کی بھی تکلیف بندے کو نہیں دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی زندگی سو فیصد شریعت کے مطابق بن چکی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے: جنت کا

مزا آرہا ہے...... جنت کا مزا آرہا ہے۔ یعنی دل میں اتنا سکون ہوتا ہے کہ ان کو اس دنیا میں بیٹھے ہوئے بھی جنت کے مزے آرہے ہوتے ہیں۔ اگر اس کا نظارہ دیکھنا ہو تو آپ ایک ہفتہ کسی دنیا دار کے ساتھ بھی رہ کر دیکھ لیں، آپ اس کی زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں دیکھیں گے، اور ایک ہفتہ کسی اللہ والے کے پاس رہ کر دیکھ لیں، آپ اس کی زندگی میں جنت کا منظر دیکھیں گے کہ ان کے دل میں جس چیز کی خواہش ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ پورا کر دیتے ہیں۔ راستے کھول دیتے ہیں، عزتیں دیتے ہیں، محبتیں دیتے ہیں۔ تو ان کی دنیا کی زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔

تو مسلماں ہے تو تدبیر ہے تقدیر تیری:

آج یہ Concept (سوچ) ٹھیک کر لیں۔ یہ نہ سوچیں کہ ہمیں پڑوسی نے تنگ کیا ہوا ہے...... ہمیں رشتہ داروں نے تنگ کیا ہوا ہے...... مجھے بیوی نے تنگ کیا ہوا ہے...... مجھے خاوند نے تنگ کیا ہوا ہے۔ بھئی! کسی نے کسی کو تنگ نہیں کیا ہوا ہے۔ ہمیں ہمارے نفس نے تنگ کیا ہوا ہے۔ ہم آج نفس کے اوپر زبردستی کریں اور اس کو شریعت کی لگام پہنا دیں تو دیکھنا اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کیسے عزتوں کے دروازے کھول دیں گے۔ علامہ اقبال نے کتنے اچھے اشعار لکھے، کہتے ہیں:

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبس ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اگر ہم نیکی کو اپنا لیں گے تو ہمیں اللہ تعالیٰ ایسا بنا دیں گے کہ ہم جو تدبیر کریں گے

اللہ تعالیٰ اسی کو ہماری تقدیر بنا دیں گے۔ ع

تُو مسلماں ہے تو تدبیر ہے تقدیر تیری

لہٰذا آج کی اس مجلس میں ہم اپنے پچھلے سب گناہوں سے سچی پکی توبہ کر کے دل میں یہ نیت اور ارادہ کریں کہ اے اللہ! آج کے بعد ہم آپ کے نافرمانی نہیں کریں گے...... ہم آپ کو راضی کرنے کے لیے گناہوں کو چھوڑ دیں گے...... ہم گناہوں کو چھوڑیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے ہمیں دنیا و آخرت کی عزتیں عطا فرمائیں گے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

باکمال زندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾
[الملک:۲]

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

انسان کی فطرت:

ہر انسان فطری طور پر Excellence کو پسند کرتا ہے۔ Excellence کمال کو کہتے ہیں۔ ہر بندہ کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ

......میری تعلیم Excellent (باکمال) ہو۔

......میری صحت Excellent ہو۔

......میری بیوی Excellent ہو۔

......میرا بزنس Excellent ہو۔

......میرے پاس گاڑی بھی Excellent ہو۔

......آگے میری اولاد بھی Excellent ہو۔

گویا ہر چیز میں وہ Excellence (کمال) کو پسند کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ آج کی اس محفل کا عنوان یہی ہے کہ ہم Excellence کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

Excellence (کمال) عادت سے حاصل ہوتا ہے:

Excellence is not an act, it is a habit.

Excellence کوئی ایک کام نہیں ہوتا، وہ عادت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسا نہیں ہوسکتا کہ اچانک ایک بچہ سکول میں فرسٹ آ جائے۔ وہی بچہ فرسٹ آتا ہے جو پورا سال کلاسیں باقاعدگی سے لیتا ہے اور محنت کرتا ہے۔ وہ درمیان کی ٹرم میں بھی ٹاپ کرتا ہے اور پھر فائنل میں بھی وہی ٹاپ کر جاتا ہے۔ تو یہ ایک Habit (عادت) ہوتی ہے۔

کمال حاصل کرنے کی دو شرائط:

Excellence achieve (کمال حاصل) کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

(1) مقصد واضح ہو:

پہلی بات یہ ہے کہ Objective clear (مقصد واضح) ہونا چاہیے۔ جن لوگوں نے بھی دنیا میں Excellence (کمال) حاصل کیا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے Goal Oriented (مقصدیت سے بھرپور) زندگی گزاری۔ ان کا ایک مقصدِ زندگی تھا، ان کے سامنے ایک منزل تھی، جس تک وہ پہنچنا چاہتے تھے اور اس Objective

کی وجہ سے پھر انہوں نے اپنی زندگی Directed (باسمت) گزاری۔ جس بندے کو Objective (مقصد) ہی Clear (واضح) نہ ہو کہ میں نے Achieve (حاصل) کیا کرنا ہے تو وہ کیسے اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہے؟ اس لیے مقصدِ زندگی واضح ہونا، یہ سب سے پہلی شرط ہے۔

② مسلسل محنت ہو:

دوسرا اس کے بعد Efforts (کوشش) کرنا۔ Continued efforts (جہدِ مسلسل) سے اور سخت محنت کرنے سے انسان کو Excellence (کمال) حاصل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی بندہ ایسا نہیں کہ جس کو بغیر محنت کے Excellence (کمال) مل گیا ہو، محنت کرنی پڑتی ہے۔

عالمی چمپئن بننے کے لیے ہزاروں گھنٹے کی محنت:

چنانچہ ایک بندہ جو سوئمنگ (تیراکی) کے اندر دنیا کا چمپئن بنا۔ اس کی Life history (سوانح عمری) میں لکھا ہوا تھا کہ وہ نو مہینہ کا تھا جب اس کی والدہ نے اس کو سوئمنگ پول کے اندر پھینک دیا...... سائنس کہتی ہے کہ نو مہینہ کا بچہ اگر پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ Servive (زندگی بچانے) کے لیے کوشش کرتا ہے۔ آج کل تو بچوں کی Swimming Costume (لباسِ پیراکی) ایسی آگئی ہیں کہ بچہ ڈوبتا نہیں Float کرتا رہتا ہے، لیکن وہ تیرنا سیکھتا ہے...... جس بچے کو اس کی والدہ نے نو مہینہ کی عمر میں پانی میں ڈال دیا، وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد میرے دن کے دو گھنٹے روزانہ سوئمنگ پول میں گزرتے تھے۔ اتنی مشقت کرتے کرتے جب وہ انتیس سال کا ہوا، تب وہ عالمی چمپئن بنا۔ تو آپ غور کریں کہ اس کے لیے کتنی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ نو مہینے سے اس

نے تیرنا سیکھنا شروع کیا اور انتیس سال کی عمر میں جا کر وہ عالمی چمپئن بنا۔
چنانچہ جتنے لوگ بھی دنیا میں چمپئن بنے، انہوں نے ریکارڈ قائم کیے۔ تاریخ کے اندر ان کا جب انٹرویو لیا گیا تو پتا چلا کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کمال کو حاصل کرنے کے لیے ہزاروں Man hours (افرادی گھنٹے) لگائے تھے۔
مثال کے طور پر ایک بندہ اگر روزانہ دو گھنٹے کسی کام میں لگاتا ہے تو ایک مہینہ میں 60 گھنٹے ہو گئے اور بارہ مہینوں میں 720 گھنٹے ہو گئے۔ اب اگر ایک سال میں 700 گھنٹے لگتے ہیں تو گویا اس کو دس ہزار Man hours (افرادی گھنٹے) لگانے کے لیے دس پندرہ سال چاہییں۔ اب اگر وہ دس پندرہ سال اپنی فیلڈ میں محنت کرے گا، تب جا کر وہ Excelence (کمال) حاصل کر سکے گا۔ آج اتنی محنت نہیں کی جاتی جس وجہ سے کمال حاصل نہیں ہوتا۔

نوبل پرائز وِنر کی محنت:

ایک مرتبہ اس عاجز کی ملاقات ایک نوبل پرائز وِنر (جیتنے والے) سے ہوئی۔ اس سے سوال کیا گیا کہ آپ نے نوبل پرائز لیا، آپ بڑے عقل مند ہوں گے۔ اس نے کہا: جی سچی بات تو یہ ہے کہ میں Average I/Q Level (اوسط ذہانت) کا بندہ ہوں، میں کوئی انوکھا عقل مند نہیں ہوں۔ میں نے کہا: پھر آپ کو نوبل پرائز کیسے ملا؟ اس نے کہا: میں نے اس کے لیے Efforts (کاوشیں) بہت کی ہیں۔ پوچھنے والے نے کہا: سائنس پڑھنے والا ہر طالب علم کوشش کرتا ہے، وہ تو کتابی کیڑا ہوتا ہے، ہر وقت کتاب پر جھکا ہوا پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس نے کہا: نہیں! جتنا میں نے پڑھا، اتنا کوئی نہیں پڑھتا۔ تو پروفیسر نے کہا: آپ نے کتنا پڑھا؟ اس نے کہا: کیمسٹری کی ایک کتاب تھی، میں نے

اسے پڑھا، مجھے سمجھ نہیں آئی۔ میں نے اسے دوسری مرتبہ پڑھا، پھر تیسری مرتبہ پڑھا، حتیٰ کہ میں نے 63 دفعہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا، تو مجھے پوری کتاب کا Concept (مفہوم) Clear (واضح) ہو گیا۔

اس کی بات سن کر حیرانی ہوئی کہ واقعی تریسٹھ دفعہ کورس کو کون پڑھتا ہے؟ آج کل کے طلبہ کا تو یہ حال ہے کہ ایک دفعہ کورس پڑھ لیں تو ماں باپ پر احسان، اور اگر دو دفعہ کورس Cover کر لیں تو اپنے پروفیسر پر بھی احسان کہ ہم نے جی دو دفعہ کورس کی دہرائی کر لی ہے۔ جب اس بندے نے 63 مرتبہ ایک کتاب کو پڑھا تھا تو اس کا Concept تو Clear ہونا ہی تھا۔ تو Continued efforts (مسلسل کوشش) کے بعد جا کر انسان کو Excellence حاصل ہوتی ہے۔ میں اس کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تا کہ بات کھل کر سامنے آجائے۔

خلاباز کا حیرت انگیز کارنامہ:

چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایک بندے نے دنیا میں سب سے لمبی چھلانگ لگائی۔ وہ ایک Astronaut (خلاباز) تھا، جس نے جہاں سے Space (خلا) شروع ہوتی ہے، وہاں سے اس نے نیچے زمین کے اوپر چھلانگ لگائی...... یہ اوپر سے نیچے چھلانگ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ عام آدمی چھلانگ لگائے گا تو اس کی موت تو زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ انسان کو Acceleration (اسراع) ہلاک کرتا ہے...... ایک سائنسی بات سمجھ لیجیے۔ لوگ لکھتے ہیں Speed Kill (رفتار ہلاک) کرتی ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اصل میں سپیڈ کی وجہ سے انسان کا Acceleration (اسراع) بڑھ جاتا ہے اور وہ انسان کو ہلاک کرتا ہے۔ کئی مرتبہ ایسا

ہوتا ہے کہ ایک آدمی گاڑی پر سفر کر رہا ہوتا ہے، اس نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی ہوتی، اب اس کا ٹکراؤ ہوا تو ایکسیڈنٹ کی وجہ سے گاڑی تو زیرو سپیڈ پر آجاتی ہے، مگر سیٹ بیلٹ نہ ہونے کی وجہ سے جسم کی حرکت رہتی ہے تو جسم اسی اسراع کے ساتھ حرکت کرتا ہے، یہ Acceleration (اسراع) بندے کے دل کو بند کر دیتا ہے۔ اس لیے کئی مرتبہ انسان کو جسمانی چوٹ نہ بھی لگے پھر بھی بندہ مرجاتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ Acceleration (اسراع) اگر 7 سے زیادہ ہوجائے تو بندے کی موت فوراً واقع ہوجاتی ہے۔ لہٰذا عام بندہ اگر چھلانگ لگائے تو وہ ہوا میں ہی Acceleration (اسراع) کی وجہ سے مرجائے گا۔ لیکن اس سے بچاؤ کے لیے اپنے جسم کو مضبوط بنانا پڑتا ہے، محنت کرنی پڑتی ہے۔ اب جس بندے نے خلا کے سرے سے زمین پر چھلانگ لگائی، اس نے پتا نہیں کتنی مشق کی ہوگی! کتنا اپنی صحت کا خیال رکھا ہوگا!

ہمیں اس کے بارے میں ایک Documentary دیکھنے کا موقع ملا۔ جب خلاباز نے Space Ship (خلائی جہاز) سے نیچے چھلانگ لگائی تو اس نے Whirl کرنا (گھومنا) شروع کر دیا، اس تیزی سے وہ گھوم رہا تھا کہ اس کی Heart Beat (دل کی دھڑکن) بہت تیز ہوگئی...... یہاں میڈیکل ڈاکٹر موجود ہوں گے، بچہ جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا Maximum Heart Rate (زیادہ سے زیادہ دل کا دھڑکنا) 220 فی منٹ تک جاتا ہے۔ اس سے اوپر نہیں جاسکتا۔ پھر جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر کسی بندے نے اپنے دل کا ٹیسٹ کروانا ہو تو اس کی زیادہ سے زیادہ شرح: Age - 220 (220 منفی بندے کی عمر) ہونی چاہیے۔ مثلاً: میری عمر 60 سال ہے، تو 220 میں سے 60 تفریق کریں گے، تو 160 بن جائے گا۔ تو اگر

میں اپنا دل چیک کروانے بھی لگوں تو میرا زیادہ سے زیادہ ہارٹ ریٹ 160 تک جا سکتا ہے، اس کے اوپر ہوگا تو یقیناً ہارٹ اٹیک ہوگا۔ ویسے تو سائنس کہتی ہے کہ 120 کے اوپر دھڑکن چلی جائے تو ہارٹ اٹیک کا Risk (خطرہ) شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر 160 سے اوپر جائے گا پھر تو یقینی ہارٹ اٹیک ہوگا...... جب اس نے گھومنا شروع کیا تو میں سکرین پر دیکھ رہا تھا کہ اس وقت اس کی ہارٹ بیٹ 190 ہو چکی تھی۔ میں حیران ہو کر دیکھ رہا تھا، یا اللہ! اس بندے کا ہارٹ ریٹ 190 ہے، اور یہ پھر بھی Servive (زندگی کی کوشش) کر رہا ہے، اور وہ بول رہا تھا کہ میں اس وقت بہت گھوم رہا ہوں اور عجیب Condition (کیفیت) میں ہوں۔ پھر اس حالت سے وہ نکلا تو جیسے گولی تیز رفتاری سے چلتی ہے، اس طرح اس نے زمین کی طرف گرنا شروع کیا۔ اس وقت اس کی رفتار 800 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ اتنی زیادہ سپیڈ کے ساتھ نیچے گرتے ہوئے، تقریباً 15 سیکنڈ کے لیے اس کی دل کی دھڑکن زیرو ہو گئی۔ اور زیرو Heart Beat پر بھی اس نے Servive کیا۔ 190 پر بھی Servive کر رہا ہے اور زیرو پر بھی Servive کر رہا ہے۔ پھر پندرہ سیکنڈ کے بعد جب اس کی سپیڈ تھوڑی سی کم ہوئی تو اس نے اپنی وہ چھتری کھولی تو اس کی وجہ سے اس کی سپیڈ تھوڑی کم ہوئی اور پھر زمین کے اوپر اس نے لینڈ کر لیا۔

میں حیران ہوا کہ یا اللہ! اس بندے نے اپنے جسم کو فِٹ رکھنے کے لیے کتنی محنت کی ہوگی کہ اس نے خلا کے کنارے سے زمین کے اوپر چھلانگ لگا کر دکھا دی۔ یہ تاریخِ انسانی میں ایک انوکھی مثال تھی، مگر اس Excellence (کمال) کو حاصل کرنے کے لیے اس کو پوری زندگی مجاہدہ کرنا پڑا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں نے کب سے Dieving (غوطہ خوری) کرنی شروع کی؟ اور یہ میرا محبوب مشغلہ تھا اور کرتے کرتے اتنے سالوں کے بعد آج میں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

آج کے نوجوان کی بدبختی:

آج کل کے نوجوان محنت ہی سے گھبراتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ کسی نوجوان کو اچھی نوکری مل جائے تو وہ خوشی خوشی بتاتا ہے کہ مجھے بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ اچھا بھئی نوکری کی کیا Specifications (خصوصیات) ہیں؟ کہتا ہے: اتنی Basic Pay (بنیادی تنخواہ) ہے، اتنا House Rent (کرایہ مکان) ہے، اتنا ٹی اے/ ڈی اے ہے، اتنا فلاں الاؤنس ہے اور اتنا فلاں الاؤنس ہے، اتنے بونس ہیں اور اتنی گریجویٹی ہے اور سارا کچھ بتانے کے بعد آخر پر وہ کہے گا کہ جی کام کوئی نہیں ہے۔ یعنی اتنے Benefits (فوائد) حاصل کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اتنی اچھی نوکری ہے کہ وہاں کام ہی کوئی نہیں ہے۔ اب جس قوم کے نوجوانوں کی ذہنیت یہ ہو کہ اچھی نوکری وہ ہے، جہاں کام کوئی نہیں تو وہ قوم کیسے ترقی کرے گی؟ اچھی نوکری تو وہ ہوتی ہے، جہاں بندہ اتنا مصروف رہے کہ اس کو پسینہ بہانا پڑے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

«أَعْطُوْا الْأَجِيْرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ»

[سنن البیہقی، حدیث: ۱۱۴۳۹]

"مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دیا کرو۔"

لیکن پسینہ تو کوئی بہائے، پسینہ تو کیا، یہاں تو ایک سے دوسرا کام کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔

کوبرا سانپ کے حملے کی سرعت:

سانپوں میں جو کوبرا سانپ ہے، وہ بہت تیز سانپ ہوتا ہے۔ اتنا تیز ہوتا ہے کہ یہ بندے کو ڈستا ہے تو بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کس وقت اس نے مجھے ڈسا، ڈسنے کے

بعد اس کو احساس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے مجھے کاٹا ہے۔ بہت تیز سانپ ہوتا ہے، اسی لیے آج تک کسی بندے نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ سانپ میری طرف بڑھ رہا ہے اور یہ میرے اوپر Attack (حملہ) کر رہا ہے اور اس نے مجھے کاٹا اور واپس گیا۔ نہیں وہ اتنا تیزی سے اٹیک کرتا ہے کہ ہماری آنکھ اسے Perceive (اندازہ) ہی نہیں کر پاتی۔ Within a second (ایک لمحہ میں) وہ ڈس لیتا ہے۔ ہاں! Slow motion (آہستہ حرکتی) تصویر آپ دیکھیں تو پھر آپ دیکھ سکیں گے کہ وہ کاٹ کیسے رہا ہے؟ ورنہ انسان اس کو Perceive (اندازہ) نہیں کر سکتا کہ وہ کتنا تیزی سے کاٹتا ہے۔ چنانچہ کوبرا سانپوں میں سے ایک سانپ سب سے زیادہ خطرناک ہے، جس کو ''بلیک ممبا'' کہتے ہیں۔ یہ افریقن سانپ ہے اور یہ اتنا تیز سانپ ہے کہ اس کے Attack کا پتا ہی نہیں چلتا اور اس کی جو سپیڈ ہے وہ 8 فٹ فی سیکنڈ ہے۔ یعنی کوئی بندہ آٹھ فٹ دور کھڑا ہے تو وہ ایک ہی سیکنڈ میں اس کو Bite (ڈس) کر کے واپس چلا جائے گا اور بندے کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ یہ اتنا تیز سانپ ہے۔

باکسنگ کے عالمی چمپئن کی محنت:

لیکن ایک باکسر کا نام آپ نے سنا ہوگا، مائیک ٹائی سن۔ اس کے حالاتِ زندگی مَیں پڑھ رہا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس نے اتنی محنت کی، اتنی Exercise (مشق) کی کہ وہ جب دوسرے بندے کو Punch (مُکّا) مارتا تھا تو اس کا جو مُکّا تھا وہ 32 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے ایڈوانس کرتا تھا۔ بلیک ممبا 8 فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے بڑھتا ہے اور یہ بندہ اتنا Quick (تیز) ہے کہ 32 فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے حملہ کرتا ہے، اگلے کو پتا ہی نہیں چلتا تھا اور اس کو مُکّا پڑ جاتا تھا اور وہ ناک آؤٹ ہو جاتا تھا۔ تو آپ سوچیں کہ اس سپیڈ کو حاصل کرنے کے لیے اس کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی۔ اس نے لکھا کہ

میرے گھر والے سوئے ہوئے ہوتے تھے اور میں اکیلا جوگنگ کرتا پھر رہا ہوتا تھا۔ میں دن میں کم از کم تین گھنٹے Leather (چمڑے) کے ایک Pillow (تکیہ) کو مکے مارا کرتا تھا۔ تو مستقل اتنی ورزش کرنے کے بعد اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس کا Punch (مُکّا) کئی ٹن کے حساب سے انسان کو پڑتا تھا۔ اتنی پاور کا حاصل کرنا، اور اتنی تیزی کا حاصل کرنا، اس کے پیچھے اس کی Efforts (کوششیں) تھیں۔ اس لیے وہ عالمی چمپئن بنا۔

نیوٹن کی انتھک محنت:

کئی مرتبہ تو Excellence پانے کے لیے انسان کو ہر فیلڈ میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ جو انسان سائنس کی دنیا میں کام کرتے ہیں، وہ بھی بہت Efforts (کوششیں) کرتے ہیں۔ پتا نہیں کتنے Man Hours (افرادی گھنٹے) لگاتے ہیں، تب جا کر وہ کسی چیز کے Inventor (موجد) بنتے ہیں۔ نیوٹن نے Laws of motion (قوانینِ حرکت) drive اخذ کیے تو اس محنت پر کئی سال لگے۔ پھر جب اس نے سارے قوانین (اخذ) کر لیے تو بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا: اچھا! میں ذرا باتھ روم سے فارغ ہو لوں تو میں ان کو Neat (صاف کر کے درج) کروں گا۔ جب وہ باتھ روم گیا تو پیچھے اس کے کمرے میں جو چراغ چل رہا تھا، وہ گر گیا اور کمرے میں جتنے کاغذ تھے سارے کے سارے جل گئے۔ اب یہ جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی کئی سالوں کی محنت راکھ بنی پڑی ہے، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری...... کوئی ہم جیسا ہوتا تو غش کھا کر گر جاتا، ڈیپریشن میں پڑ جاتا کہ میری اتنی محنت چلی گئی...... اس نے کہا کہ نہیں! میں نے اگر پہلے محنت کر کے ان کو اخذ کر لیا تھا تو میں اب دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔ اس نے نیا کاغذ لیا اور نئے سرے سے ذہن میں جو یادداشتیں تھیں، ان کے حساب سے ان

پر پھر کام شروع کیا اور اگلے دو سال میں اس نے ان Equations (مساوات) کو دوبارہ Derive (اخذ) کرلیا اور وہ دنیا کا ایک بہت بڑا سائنسدان بن گیا۔

بغیر محنت کسی میدان میں کمال نہیں ملتا:

یاد رکھیں! دنیا میں جن لوگوں نے بھی نام پایا، دین کا میدان ہو یا دنیا کا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بہت Efforts (محنتیں) کیں۔ آج کے نوجوان کے اندر یہی کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہم میں سے ہر بندہ مفتی بننا تو پسند کرتا ہے، لیکن بن پڑھے۔ دین کا پتا نہیں ہوتا اور جو فتویٰ چاہو اس کی زبان سے سن لو۔ انسان کو ایسے تو Excellence نہیں ملتی۔

یہ لوگ جو علماء بنتے ہیں، انہوں نے دین سیکھنے کے لیے بہت محنت کی ہوتی ہے۔ ایک طالب علم فرض کرو ہر دن میں چھ گھنٹے پڑھتا ہے تو وہ ایک مہینے میں تقریباً 200 Man hours (دوسو افرادی گھنٹے) پڑھے گا۔ اگر ایک مہینے میں 200 گھنٹے ہیں تو ایک سال کے اندر 2400 Man hours (چوبیس سو گھنٹے) ہو گئے، آپ ایک سال میں دو ہزار گھنٹے لگا لیں۔ یہ آٹھ سال پڑھتے ہیں تو آٹھ سال کا مطلب ہے 16000 Man hours (سولہ ہزار افرادی گھنٹے)۔ 16000 گھنٹے لگانے کے بعد وہ عالم بنتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر فتویٰ پوچھنا ہو تو عالم سے پوچھنا چاہیے کیونکہ اس نے اس میں Excellence (کمال) پایا ہوتا ہے، علم حاصل کیا ہوتا ہے۔ ہر بندہ عالم نہیں بن سکتا، اس کے لیے محنت کرنی ہوتی ہے۔

تو Excellence حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک Object Clear (مقصد واضح) ہونا چاہیے اور دوسرا انسان اس کے لیے Efforts (محنت) کرے۔ جتنی محنت کرے گا اتنا ثمر ملے گا۔

مشائخ کا عبادت میں Excellence (کمال):

دین کے میدان میں ہمارے علاقے میں جتنے اولیاء گزرے، جیسے حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مشائخ، یہ سارے کے سارے وہ تھے کہ جنہوں نے Excellence کو حاصل کیا، مگر ان کے حالاتِ زندگی کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ روزانہ ان کے گھنٹوں مصلّے کے اوپر گزرتے ہوں گے۔ کبھی نماز پڑھتے ہوئے، کبھی تلاوت کرتے ہوئے، کبھی ذکر و مراقبہ کرتے ہوئے، ہر روز وہ گھنٹوں مصلّے پر بیٹھتے تھے، پھر جا کر ان کو وہ Excellence (کمال) حاصل ہوا کہ وہ ولایت کے اتنے بڑے مقام کو پہنچ گئے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا علمِ حدیث میں Excellence (کمال):

محدثین میں ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ ایک بڑے امیر باپ کے بیٹے تھے، سونے کی چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی زندگی کھیل کود میں گزر گئی، پھر ماں باپ کی دعائیں رنگ لائیں اور اللہ نے ان کے دل میں علم حاصل کرنے کا شوق ڈالا۔ یہ فرمایا کرتے تھے: میں نے اپنی زندگی میں چار ہزار اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ ہم اپنی زندگی میں اپنے استادوں کو گننا شروع کردیں تو دوسو سے کم ہی ہوں گے، دوسو سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ پرائمری سکول، ہائی سکول، کالج، یونیورسٹی لیول تک زیادہ سے زیادہ دوسو استاد ہوں گے جن سے ہم نے پڑھا ہوگا۔ تو ہم نے علم پایا دوسو استادوں سے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں چار ہزار اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ اور کتنا سفر کیا؟ وہ کہتے ہیں: میں نے علم حاصل کرنے کے لیے اتنا سفر کیا کہ اس کو شمار بھی نہیں کرسکتا۔ پھر اللہ نے ان کو اتنا بلند مقام عطا کیا کہ

اسماء الرجال کی کتب میں ان کو ''امیر المومنین فی الحدیث'' لکھا گیا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: جب وہ حدیث پڑھاتے تھے تو ایک وقت میں ان کے پاس چالیس ہزار لوگ حدیث پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ساؤنڈ سسٹم تو ہوتا نہیں تھا، تو وہ جس حدیث کی تلاوت کرتے تھے، کچھ لوگ ان سے سن کر احادیث مکبر کی طرح آگے بولتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کی مجلس کے جو Speakers (مکبر) تھے، ان کی تعداد گیارہ سو ہوا کرتی تھی۔ سوچیں کہ اگر گیارہ سو بندے سپیکر بن کر احادیث سنا رہے ہیں تو مجمع کتنا بڑا ہوگا؟ چالیس ہزار طلبہ ایک وقت میں احادیث پڑھتے تھے۔ اللہ نے اتنی قبولیت دی تھی اور انہوں نے پھر خوب احادیث کی خدمت کی۔

ان کے ایک کلاس فیلو تھے اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ فرماتے ہیں: میں بڑا حیران ہوتا تھا کہ میں ان کا کلاس فیلو ہوں، جتنا انہوں نے پڑھا اتنا میں نے بھی پڑھا، مگر یہ مقناطیس کی طرح ہیں کہ لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور ہماری طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔ مجھے ہمیشہ تجسس رہتا تھا کہ آخر کون سی بات ہے کہ ان کے اندر اتنی جاذبیت ہے؟ ایسی Magnetic Personality (مقناطیسی شخصیت) ہے ان کی۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، دو سال تک Watch (غور) کیا۔ پورے دو سال ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں صرف ایک فرق تھا۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیدار کا شرف حاصل تھا اور عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شرف حاصل نہیں تھا، اس کے علاوہ ان کی زندگی اور ان کی زندگی میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ تو دیکھیے! انہوں نے کیسی

Excellence حاصل کی کہ دیکھنے والوں کو ان کی زندگی میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا تھا۔

تو محنت کرنی پڑتی ہے، پھر اللہ رب العزت انسان کو اس کا مقصود عطا فرما دیتے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

God helps those who help themselves.

''جو خود محنت کرتے ہیں، پھر اللہ بھی ان کی تائید فرما دیتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا Excellence (کمال):

محدثین کے زمرے میں رجال الاحادیث میں ایک بزرگ گزرے ہیں، جن کا نام ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ بھی ایسی ہستی تھے جنہوں نے واقعی اپنی زندگی میں Excellence کو حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کی کتاب بخاری شریف مرتب فرمائی۔ اور یہ ایسی کتاب جس کو ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہِ'' (اللہ کی کتاب کے بعد کائنات کی سب سے صحیح کتاب) کا رتبہ دیا گیا۔ علمائے امت کا اس بات پر اجماع ہو گیا کہ قرآنِ مجید کے بعد دنیا میں سب سے صحیح کتاب یہ کتاب ہے۔ چنانچہ اس کو پڑھے بغیر کوئی بندہ عالم نہیں بن سکتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پڑھیں کہ بخاری شریف لکھنے کے لیے انہوں نے کتنی Efforts (کوششیں) کیں۔ ان کے حالاتِ زندگی میں ہے کہ وہ سولہ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اور بڑے بھائی کے ساتھ حج کرنے کے لیے حرم شریف گئے اور پھر وہاں اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے تاریخِ کبیر بھی لکھی اور اس کے بعد ''قضایۃ الصحابہ والتابعین'' کتاب بھی لکھی۔ پھر انہوں نے بخاری شریف کو مرتب کرنا شروع کیا۔ وہ فرماتے ہیں: مجھے چھ لاکھ احادیث

یاد تھیں اور ان چھ لاکھ احادیث میں سے میں نے بخاری شریف کی احادیث کو Filter (تخریج) کیا...... یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے آپ کے پاس کوئی چیز ہو تو آپ چھانتے ہیں کہ جو کوئی غیر چیز ہے وہ پیچھے رہ جائے اور اصل چیز نیچے آجائے۔ تو Filtration Process (عملِ تخریج) ان کا اتنا تھا کہ انہوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے اڑھائی ہزار کو چنا، بغیر مکرّرات کے، جو بخاری کے اندر لکھی گئیں۔ چھ لاکھ احادیث میں سے اڑھائی ہزار کو تخریج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پتا نہیں اس کے لیے انہوں نے کتنی Efforts (کاوشیں) کی ہوں گی، ان کے راویوں پر کتنی تحقیق کی ہو گی، ایک ایک حدیث پر کیسے ڈیرے ڈالے ہوں گے اور پھر جا کر انہوں اس کو چنا ہو گا کہ میں نے اسے اپنی کتاب میں لکھنا ہے۔ جب وہ لکھ لیتے تھے تو پھر فرماتے ہیں: میں ترجمۃ الباب لکھنے کے لیے دو رکعت نفل پڑھا کرتا تھا، اور اللہ سے مدد مانگا کرتا تھا۔ ہر ہر حدیث کے لیے دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے دعا مانگی، تب میں نے احادیث پاک کا ذخیرہ اکٹھا کیا۔ اب اتنی محنت کے بعد ان کو اللہ نے وہ نعمت دی کہ آج حدیث کے محدثین میں ان کا ایک Excellent (عظیم الشان) مقام ہے۔ جو بندہ ان کا نام سنتا ہے، عرب کا ہو یا عجم کا، ان کا احترام کرتا ہے۔ یہ Excellence ان کو ملی، ان کی محنت اور ان کے تقویٰ کی وجہ سے۔

ایک مرتبہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہو گئے۔ حکیم نے ان کو چیک کیا تو کہا: یہ تو وہ بندہ ہے جس نے کبھی مرچ کھائی ہی نہیں۔ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے: ہاں! پچھلے سولہ سال سے میں نے روزانہ دس پندرہ بادام کھا کر گزارا کر لیا، کبھی سالن کھایا ہی نہیں۔ پوچھا: حضرت! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: وقت بچانے کے لیے ایسے کیا۔ یعنی دس پندرہ بادام کے دانے کھا کر وہ چوبیس گھنٹے گزار لیتے تھے اور اتنا کم کھا کر باقی سارا وقت علم

حاصل کرنے میں لگاتے تھے۔تب اللہ نے انہیں اتنا علم اور قوتِ حافظہ عطا فرمائی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ حافظہ کے بارے میں صرف ایک واقعہ سنا دیتا ہوں۔

ایک مرتبہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے۔ وہاں کے لوگوں نے بڑی تیاری کی کہ وقت کے ایک بڑے ''حافظ الحدیث'' آرہے ہیں۔ یہ صرف حافظ ہی نہیں تھے، بلکہ اَلْحُجَة تھے، اور اَلْحُجَة اس کو کہتے ہیں، جس کو تین لاکھ احادیث زبانی یاد ہوں۔

چنانچہ جب یہ وہاں پہنچے تو اہلِ علم حضرات نے ان کو پرکھنے کے لیے ایک عجیب نسخہ نکالا۔ دس بندے تیار کیے اور ہر بندے کو دس دس روایات اس طرح یاد کروائیں کہ کسی کا متن تبدیل کر دیا اور کسی کی سند میں تبدیلی کر دی، ایک حدیث کی سند دوسری کو لگا دی اور دوسری کی پہلی کو لگا دی، اور کہا گیا کہ جب وہ آئیں تو ان کے سامنے باری باری ہر بندہ یہ دس دس روایات پڑھے گا، اگر واقعی ان کو احادیث یاد ہوں گی تو وہ پہچان جائیں گے، ورنہ وہ دھوکا کھا جائیں گے۔

ان کو Receive کرنے والا مجمع لاکھوں کی تعداد میں تھا۔ خیر! لوگوں نے ان کا استقبال کیا، بٹھایا اور پھر ان کی تعریف کی گئی کہ قوّتِ حافظہ بہت تیز ہے اور بہت ساری احادیث ان کو یاد ہیں۔

پھر ایک بندہ اُٹھا اور کہا: مجھے یہ حدیث پہنچی ہے، کیا آپ نے یہ سنی ہے؟ جب اس نے حدیث سنائی تو آپ نے فرمایا: لَا اَعْرِفُهٗ [مجھے نہیں پتا]۔ دیکھیں! بندے کو کتنی حیرانگی ہوتی ہے کہ اب تک تو اس کی تعریفیں ہوتی رہیں اور اب بیٹھا کہہ رہا ہے کہ مجھے نہیں پتا۔

پھر اس نے دوسری حدیث پڑھی اور پوچھا: آپ کو آتی ہے؟ فرمایا: لَا اَعْرِفُهٗ [مجھے نہیں پتا]۔ پھر تیسری کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا: لَا اَعْرِفُهٗ [مجھے نہیں پتا]۔ اسی طرح

دس احادیث کے بارے میں پوچھا گیا اور جواب یہی تھا کہ لَا أَعْرِفُهُ [مجھے نہیں پتا]۔
اس دوران مجلس میں موجود علماء حیرانگی سے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگ گئے اور کہہ رہے تھے کہ اب جس کو بھی اس بات کا پتا چلے گا، وہ ان کے حافظے کی کمزوری کو سمجھ جائے گا۔
اب دوسرا شخص کھڑا ہوا، اس نے بھی دس حدیثیں پوچھیں تو ہر ایک کے جواب میں فرمایا: لَا أَعْرِفُهُ [مجھے نہیں پتا]۔ اسی طرح دس بندوں نے دس دس احادیث کے متعلق سوال کیا تو سب کے جواب میں یہی کہا: لَا أَعْرِفُهُ [مجھے نہیں پتا]۔ جب امام بخاری رحمہ اللہ نے دیکھا کہ سوال کرنے والے ختم ہو گئے تو پھر اس کے بعد سوال کرنے والے دس افراد میں سے پہلے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: آپ نے پہلی حدیث اس طرح سنائی تھی، وہ غلط ہے، صحیح اس طرح ہے، اور دوسری حدیث آپ نے اس طرح پڑھی، وہ غلط ہے اور صحیح اس طرح ہے۔ انہوں نے دس آدمیوں کی غلط طریقے سے پڑھی ہوئی سو احادیث پہلے اس طرح سنائیں جس طرح انہوں نے پڑھی تھیں، پھر ان کے متون اور سند وغیرہ کو درست کر کے صحیح طریقے سے پڑھیں اور بتا دیا کہ صحیح اس طرح ہے، آپ لوگوں نے غلط پڑھا تھا۔

لوگ امام بخاری رحمہ اللہ کی قوتِ حافظہ پر حیران رہ گئے کہ جس ترتیب سے جو غلط روایات ان لوگوں نے پڑھی تھیں وہ سو بھی سنا دیں اور ان کو درست کر کے سو حدیثیں بھی سنا دیں۔ [فتح الباری لابن حجر: ۱/۴۸۶]

اللہ نے ان کو ایسی قوتِ حافظہ عطا فرمائی تھی۔ تو یہ Excellence ان کو ملی۔ انہوں نے Continued Efforts (مسلسل کاوشیں) کیں، پتا نہیں کتنے Man hours (گھنٹے) لگائے تو اللہ نے ان کی محنت کو قبول فرما لیا۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فقہ میں Excellence (کمال):

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو دیکھیں، آپ کو یہی چیز نظر آئے گی۔ان کا سارا دن اپنے شاگردوں کے ساتھ علمی حلقوں میں گفتگو میں لگتا تھا۔اور جب رات آتی تھی تو اللہ کے سامنے عبادت میں مصروف ہوجاتے تھے۔حتیٰ کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے، یہ ان کی زندگی کا معمول تھا......اب یہاں پر کسی کو یہ شبہ نہ پڑے کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز چالیس سال تک، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ عرف میں کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک بندہ اگر عالم بنے اور اس کے بعد کسی مدرسے میں پڑھانا شروع کردے، اور مدرسے میں پڑھاتے پڑھاتے وہیں ان کی وفات ہوجائے تو لوگ کہتے ہیں: جی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزار دی۔کیا مطلب؟ کیا جمعہ کے دن کی چھٹی نہیں ہوتی تھی؟ یا کبھی ان کا بیماری کی وجہ سے ناغہ نہیں ہوا؟ بھئی! یہ عرف میں بات کہی جاتی ہے کہ زندگی کا یہ معمول تھا......اسی طرح عرف میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ چالیس سال تک معمول تھا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔

قرآنِ مجید میں بھی یہی عرف کی باتیں کہی گئی ہیں۔مثلاً تورات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾[النحل:۸۹]

''ہر چیز کو واضح کرنے والی۔''

اب بتائیں کہ یہ جو آسمانی کتابیں ہیں، ان میں سائنس کا علم ہے؟ میڈیکل کا علم ہے؟ نیوکلیئر کا نالج ہے؟ انجینئرنگ کا علم ہے؟ یہ کوئی ٹیکنالوجی کی کتابیں تو نہیں ہیں، یہ تو کتبِ ہدایت ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے کُلّ کا لفظ اس لیے استعمال فرما دیا کہ ہدایت کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمام اس کے اندر موجود ہیں۔مگر کوئی کُلّ کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ

جائے کہ کُلّ کہا گیا کہ ہر چیز اس میں ہے، تو ہر چیز کا یہ مطلب تو نہیں لیا جائے گا۔

قرآنِ مجید میں ہے کہ ملکۂ بلقیس ایک ملکہ تھی، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [النمل:۲۳]

''اور اس کو ہر طرح کا ساز و سامان دیا گیا ہے۔''

ہر چیز اس زمانے میں جو عرف میں ہوتی تھی وہ دی گئی تھی۔ اب کوئی پوچھے کہ اس کے زمانے میں ریفریجریٹر تھا؟ اس کے زمانے ایئر کنڈیشنر تھا؟ اس کے زمانے میں لینڈ کروزر گاڑی تھی؟ جی کُلّ کا لفظ ہے تو کُلّ کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز اس کے پاس تھی۔ بھئی! تم اپنی عقل کا علاج کرواؤ، اس کُلّ سے مراد اس زمانے میں جتنی معروف چیزیں تھیں وہ تمام اس کے پاس موجود تھیں۔

تو قرآنِ مجید میں بھی عرف کو لیا گیا ہے، اور اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ چالیس سال ان کا یہ معمول رہا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، اتنی Efforts وہ اپنے رب کو منانے کے لیے کرتے تھے۔ اور اتنی Efforts وہ علم کی خدمت کے لیے کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں چھ لاکھ مسائل کا جواب انہوں نے لکھوا دیا۔ اپنے شاگردوں سے چھ لاکھ مسائل کا جواب لکھوانا کوئی آسان کام نہیں ہے، پتا نہیں کتنی محنت کی ہوگی۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا طلبِ علم میں Excellence (کمال):

ان کے ایک شاگرد تھے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ ان کے ساتھ چپکے رہتے تھے۔ ایک لمحہ بھی ان سے آگے پیچھے ہونا پسند نہیں کرتے تھے کہ کہیں استاد کوئی بات کہے اور

میں اس کو سن نہ سکوں، ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حضرت کے ساتھ بیٹھے تھے اور مجلسِ مذاکرہ چل رہی تھی۔ اطلاع ملی کہ آپ کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی ہے، آپ گھر آئیں، بچے کے کان میں اذان کہیں اور اور تحنیک (گھٹی) دیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے پیغام بھجوا دیا کہ فلاں جو ہمارے قریبی عالم ہیں، وہ بڑے ہیں، ان کو بلا کر اذان بھی دلوا دو اور تحنیک بھی کروا دو۔ چنانچہ بچے کی تحنیک بھی ہوگئی، بچے کی اذان بھی کہہ دی گئی۔ پھر دو چار گھنٹوں کے بعد پیغام آیا کہ بچے کی طبیعت خراب ہو رہی ہے، آپ تشریف لے آئیں۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو کہہ دیا: بھئی! فلاں حکیم کو کہو، میرے بچے کو چیک کر لے۔ پھر اللہ کی شان کہ اور دو گھنٹے بعد اطلاع آئی کہ بچے کی وفات ہوگئی، آپ تشریف لائیں تاکہ کفن دفن کا انتظام ہو سکے۔ آپ نے اپنے بڑے بھائی سے درخواست کی کہ میرے بچے کو نہلا بھی دیں اور اس کو کفنا بھی دیں، اور اس کی جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے اسے یہاں لے آئیں کہ میں بھی جنازہ میں شریک ہو جاؤں گا۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے کا جنازہ مسجد میں لایا گیا اور وہاں انہوں نے شرکت کی۔ جب انہوں نے قبرستان لے جانا تھا تو پھر انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو درخواست کی کہ پلیز آپ میرے بچے کو جا کر دفن کر دیں، میں اپنے استاد کی مجلس سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ بیٹے کو کسی اور نے دفن کیا اور وہ خود امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس تعلیم میں بیٹھے رہے۔

اتنی محنت کے بعد پھر ایک وقت آیا کہ جب وہ اسلامی دنیا کے چیف جسٹس بنے۔ گیارہ صوبے تھے، ہر صوبے کا ایک قاضی ہوتا تھا، ان قاضیوں کے اوپر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بڑے قاضی بنے۔ ان کو جو Excellence ملی، اس کے پیچھے ان کی قربانیاں دیکھیں تو آپ حیران ہو جائیں گے۔ اتنی قربانیوں کے بعد، اتنی محنت کے بعد،

پھر اللہ تعالیٰ بندے کو کمال عطا کر دیتے ہیں۔

سب سے Excellent (کامل) زندگی:

اس کائنات میں سب سے زیادہ Excellent Life (کامل زندگی) اگر کسی کی ملتی ہے تو وہ سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی مبارک زندگی ہے۔ سب سے زیادہ کامل زندگی ہے۔ باقی جتنے انسانوں کی زندگیاں ہیں، وہ ناقص زندگیاں ہیں...... یہ نکتے کی بات ہے کہ باقی تمام انسانوں کی زندگیاں ناقص زندگیاں ہیں۔ وہ کیسے؟ کسی سائنس دان کی وفات ہوئی، لوگ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا سائنس دان تھا، اس نے یہ تحقیق کی، یہ تحقیق کی، اور ابھی تو وہ اور تحقیقات کرنا چاہتا تھا، زندگی نے وفا نہ کی اور وہ فوت ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ کامل زندگی نہیں تھی، ادھوری زندگی تھی۔ کسی بڑے فاتح کی بات کریں تو کہتے ہیں: فلاں بندے نے، جیسے امیر تیمور نے دنیا کو فتح کیا، ابھی وہ اور زیادہ فتوحات کرنا چاہتے تھے، زندگی نے وفا نہ کی اور موت آ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ جتنی بھی Achievements (کامیابیاں) تھیں ان کے باوجود ان کی زندگی ادھوری تھی۔ دنیا میں بڑے بڑے علماء آئے اور انہوں نے بڑی کتابیں لکھیں، ہزاروں کی تعداد میں۔ لیکن لکھنے والوں نے لکھا کہ ان کی کتابیں اتنی اعلیٰ، اتنی اچھی، لیکن وہ اور بھی لکھنا چاہتے تھے، وقت نے وفا نہ کی اور وہ دنیا سے چلے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے لوگوں کی زندگیاں ہیں، جس میدان میں بھی، وہ سب کی سب ادھوری زندگیاں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں: جی علامہ اقبال نے بہت اچھی شاعری کی، وہ شاعرِ مشرق تھے، وہ ابھی امت کے بارے میں اور بھی لکھنا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ اس کا مطلب جتنی بھی Achievements (کامیابیاں) تھیں، ان کے بعد

بھی لوگوں نے کہا کہ ابھی زندگی ناقص تھی، ادھوری تھی، جو Wish (تمنا) تھی اسے پورا نہ کر سکے، اسے حاصل نہ کر سکے۔ تو کائنات میں جتنے بھی لوگ گزرے، ہر کسی کے بارے میں یہی کہا گیا کہ انہوں نے بڑے اچھے کام کیے، بڑے اعلیٰ کام کیے، مگر اور بھی کرنا چاہتے تھے، زندگی نے وفا نہ کی نہ کر سکے۔ لیکن ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کا مجمع ہے، اور رات کی تاریکی میں نہیں، دن کی روشنی میں اللہ کے محبوب ﷺ اس سوا لاکھ مجمع سے یہ پوچھتے ہیں: لوگو! جو مقصد میں لے کر آیا تھا، بتاؤ وہ امانت میں نے ادا کر دی یا نہیں کی؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار لوگ کہتے ہیں:

''نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ''

''ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ ﷺ نے دین کو ہم تک پہنچا دیا اپنے فرض کو ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کی۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا بایں طور کہ اسے آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر لوگوں کی طرف جھکا کر کہا:

((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۳۰۰۹]

''اے اللہ! اپنے بندوں کے اس اقرار اور اعتراف پر تو گواہ رہ۔ اے اللہ! تو گواہ رہ۔ اے اللہ! تو گواہ رہ۔''

اے اللہ! اس بات کا گواہ رہنا کہ جو مقصد میرا دنیا میں آنے کا تھا، میں اس کو پورا کر کے جا رہا ہوں۔ ایک زندگی ایسی ہے جو کامل زندگی نظر آتی ہے۔

باکمال بننے کے لیے نبی علیہ السلام کو اپنا قائد بنائیں:

تو آج ہمیں چاہیے کہ ہم اسی شخصیت کو اپنا امام بنائیں، اپنا مقصد بنائیں، اپنا قائد بنائیں۔

میرا قائد ہے وہ زندگی پیغام تھا جس کا
محبت نام تھا جس کا ، محمد نام تھا جس کا
وہ رفتہ رفتہ جس نے قوم کو منزل عطا کردی تھی
کلی آغاز تھی جس کی ، چمن انجام تھا جس کا

تو اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی کامل زندگی گزاری۔ آیئے! ان کو ہم اپنی زندگی کا قائد مانتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا آج ہم عہد وارادہ کرتے ہیں۔ ہم ایک کامل واکمل شخصیت کو اپنی زندگی کا قائد مانیں گے تو یقیناً ہمیں بھی ان کی پیروی سے کمال حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ﴾

[آل عمران:۳۱]

''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

تو نبی علیہ السلام کی پیروی کرنے سے ہم اللہ کے محبوب بن جائیں گے۔ ہمیں اس دنیا میں Excellence حاصل ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک Excellent (کامل) زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، محنت سے بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خوب محنت کریں، کام کرکر کے اپنے آپ کو تھکائیں اور

تھک تھک کر پھر آپ کام میں لگ جائیں۔ جب اتنی محنت کریں گے تو پھر اللہ رب العزت کے ہاں قبولیت ہوگی۔ اس محنت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ چندروزہ زندگی ہے، بالآخر یہ محنت کا وقت گزر جائے گا۔

نور میں ہو یا نار میں رہنا
ہر جگہ یادِ یار میں رہنا
چند جھونکے خزاں کے بس سہہ لو
پھر ہمیشہ بہار میں رہنا

زندگی کے یہ خزاں کے چند جھونکے سہہ لیجیے۔ پھر ان شاء اللہ، اللہ کے ہاں جائیں گے، زندگی میں Excellence ہوگی، اعمال اچھے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے، پھر ہمیشہ بہار میں رہنا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں Excellent Life گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

دین کی محنت کا جذبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾﴾ (النجم:۳۹،۴۰)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

انسان درخت نہیں کہ کھڑا رہے، پتھر نہیں کہ پڑا رہے، یہ تو اشرف المخلوقات ہے، اسے چاہیے کہ ذکر الٰہی میں لگا رہے۔ مقصد زندگی اللہ رب العزت کی بندگی اور مقصد حیات اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔

Relative Marking (تقابلی نمبرنگ) کا تصور:

اس عاجز نے UET (یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی) سے انجینئرنگ کی

ڈگری حاصل کی۔ وہ 1971ء کا بیچ تھا۔ ہمارے زمانے میں الیکٹرانکس کے ایک پروفیسر مسعود صاحب تھے۔ وہ بہت ہی سائنسدان قسم کے آدمی تھے، وہ فنا فی الالیکٹرانکس تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے الیکٹرانکس کے ساتھ شادی کی ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ الیکٹرانکس کے سوا کسی اور ٹاپک پہ بات ہی نہیں کرتے، واقعی ان کی زندگی ایسی ہی تھی۔ ان کو کسی اور سرگرمی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ ان کی زندگی میں سوشلائزیشن تھی اور نہ ہی انہیں کبھی ہنستے دیکھا گیا تھا۔ ہاں! اگر کہیں بیٹھے ہوئے کوئی الیکٹرانکس کا نام لیتا تو ایسے لگتا کہ ان کی ساری Senses (حسیں) Active (بہت تیز) ہوگئی ہیں۔ وہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس پر بات کرتے تھے۔

اس زمانے میں کراچی، لاہور یا پشاور کی یونیورسٹیوں میں اگر کبھی الیکٹرانکس کے موضوع پر کوئی بحث چھڑ جاتی تو سب یونیورسٹیوں کے پروفیسرز یہ کہتے تھے کہ مسعود صاحب کی بات فائنل ہوگی۔ یعنی وہ اپنے وقت میں الیکٹرانکس کے میدان میں اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔

ہم لوگوں نے ان سے ''انڈسٹریل الیکٹرانکس'' کا سبجیکٹ پڑھا تھا۔ ویسے وہ بہت خوش اخلاق انسان تھے، Soft speaking (نرم گو) تھے۔ مگر یونیورسٹی میں ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ظالم پروفیسر ہیں اور بہت قصائی قسم کے آدمی ہیں۔ اس لیے لڑکے دعا مانگتے تھے کہ ہمارا Subject (مضمون) ان کے پاس نہ ہو۔

اللہ کی شان کہ جب ہمیں ان کے پاس پڑھنے کا موقع ملا تو ہم نے ان کو ایک جدا انسان دیکھا۔ وہ اس وقت تک کلاس میں سمجھاتے رہتے تھے جب تک ہر بچے کا Concept (تصور) Clear (واضح) نہیں ہوجاتا تھا۔ وہ آسان طریقے سے اور اچھی اچھی مثالیں دے کر سمجھاتے تھے۔ جو پڑھنے والے بچے تھے وہ بہت زیادہ خوش

ہوتے تھے۔ اگر کوئی ایکسٹرا ٹائم میں ان سے ہیلپ لینا چاہتا تھا تو وہ مدد دینے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ مگر ان کے بارے میں یونیورسٹی میں مشہور یہی تھا کہ یہ بہت ہی سخت گیر انسان ہیں اور یہ بچوں کا کیریئر خراب کر دیتے ہیں اور ان کو فیل کر دیتے ہیں۔ ہمیں ان میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی، بلکہ لگتا یوں تھا کہ وہ سٹوڈنٹس پر باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔

لیبارٹری کے لوگ ان سے تنگ تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنے فارغ وقت میں لیبارٹری کے اندر اپنے تجربات کرتے رہتے تھے اور لیبارٹری کا عملہ فارغ نہیں رہتا تھا۔

تین مہینے پڑھانے کے بعد انہوں نے اناؤنس کیا کہ اب آپ کا سہ ماہی پیپر ہوگا۔ ہم لوگوں نے تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے ہمیں ایک بات سمجھائی کہ دیکھو! دوسرے پیپرز میں تم لوگ رٹہ لگا کر آتے ہو اور پیپر حل کر کے چلے جاتے ہو، لیکن میرے پیپر میں وہ بچہ پاس ہوگا جو Concept (فہم) کلیئر کرے گا اور اس کو اپنے سبجیکٹ کا پتا ہوگا۔

پھر انہوں نے ایک نئی بات سنائی کہ عام پیپر کے دوران آپ لوگ پیپرز پر کچھ نوٹس لکھ کر لاتے ہو اور اس سے نقل کر کے لکھتے ہو، لیکن میرا پیپر ایسا نہیں ہوگا۔ میرے پیپر میں تمہیں اپنی ٹیکسٹ بک ساتھ لانے کی اجازت ہوگی۔ یہ سن کر ہم حیران ہوئے کہ یہ تو بڑا عجیب پیپر ہوگا جس میں ہم ٹیکسٹ بک بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔

جب پیپر کا وقت ہوا تو ہم سب اپنے ہاتھ میں اتنی موٹی کتاب لے کر آئے، ہم سب بیٹھے مسکرا رہے تھے کہ آج تو پیپر بہت ہی مزے کا ہوگا کیونکہ ہم نے ٹیسٹ بک سے دیکھ کر وہ پیپر حل کر دینا ہے۔

اللہ کی شان کہ جب پیپر سامنے آیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ تھا تو کورس میں سے ہی،

مگر وہ ٹیکنیکلی اتنا مشکل تھا کہ کتاب میں سے اس کے جوابات ڈھونڈ نا مشکل تھے۔ ہر طالب علم کتاب کے صفحات الٹ رہا تھا، مگر اس کو اس کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے طلبا کا اتنا پسینہ کسی اور پیپر میں بہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا جتنا اس پیپر میں دیکھا۔ یہ بھی عجیب بات ہے نا، کہ کتاب میں سے دیکھ کر پیپر حل کرنا ہے اور حل نہیں کر پا رہے۔

خیر جب پیپر دے چکے تو اس کے بعد اسٹوڈنس کے تاثرات مختلف تھے۔ کسی نے کہا: دیکھا! یہ بندہ ہے ہی اسی قسم کا، اس کو ہمارے کیریئر کی کوئی پروا نہیں، یہ ہمیں فیل کر کے رہے گا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔

جب دو چار دنوں بعد انہوں نے پیپرز واپس کیے اور میرا پیپر میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے 100 میں سے 9 نمبر تھے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا، کیونکہ ساری زندگی میں فرسٹ، سیکنڈ پوزیشن لیتا رہا تھا، میرے دماغ میں کبھی خیال ہی نہ آیا تھا کہ میں کبھی فیل بھی ہوسکتا ہوں۔ اب 100 میں سے 9 نمبر دیکھ کر پہلے تو میں دیکھتا رہا کہ شاید 9 کے ساتھ دائیں طرف زیرو بھی لگا ہو، لیکن وہ تو 9 نمبر ہی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس Subject (مضمون) میں فیل تھا۔ میری طرح کلاس کے باقی طلبہ بھی سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔

انہوں نے پیپرز تقسیم کرنے کے بعد کہا: اچھا! میں آدھے گھنٹے کے لیے اپنے آفس جا رہا ہوں، آپ لوگ اپنے پیپر چیک کر لیں، اگر کوئی بات ڈسکس کرنی ہو تو بعد میں کر لینا۔ لہٰذا وہ کلاس سے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لڑکوں نے کہنا شروع کر دیا: لوگ صحیح کہتے تھے کہ یہ قصائی قسم کا آدمی ہے...... ان کو تو ہمارے کیریئر کی فکر ہی نہیں ہے...... کوئی کہتا: میں اپنے ابو کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

ہم نے بعد میں دوسروں کے پیپرز بھی چیک کیے جس سے پتا چلا کہ پوری کلاس کے نمبر 9 سے تھوڑے تھے۔ یعنی میں فرسٹ بھی تھا اور فیل بھی تھا۔ اتنا ناقص رزلٹ دیکھ کر سب اسٹوڈنٹس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے، وہ کہہ رہے تھے، یہ کوئی طریقہ ہے...... کیا ایسے پیپر لیا جاتا ہے...... فلاں ہے فلاں ہے۔

جب آدھے گھنٹے بعد پروفیسر صاحب واپس آئے تو لڑکوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور ان کو بتایا: جی! آپ کا پیپر تو بہت ہی مشکل بنا ہوا تھا، آپ نے ساری سائنس ہمارے ہی سامنے ظاہر کرنی تھی، آپ نے تو ہمارے کیریئر کا خیال ہی نہیں رکھا...... ہر سال کی مارکس شیٹس بھی دیکھی جاتی ہیں، ہم کس کو دکھائیں گے کہ ہمارے 9 نمبر تھے یا 8 نمبر تھے یا 7 نمبر تھے۔

انہوں نے خاموشی کے ساتھ سب کی باتیں سنیں اور پھر کہا: دیکھیں! میں آج آپ لوگوں کی Relative Marking (تقابلی نمبرنگ) کروں گا۔ یہ ریلیٹو مارکنگ کا لفظ ہمارے لیے نیا تھا۔ ہم نے اس سے پہلے یہ لفظ کبھی نہیں سنا تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا: جی! ریلیٹو مارکنگ کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے میرا نام لے کر مجھے کھڑا کیا اور کہا: اگر یہ بچہ اس سبجیکٹ میں 100 میں سے 9 نمبر لے سکتا ہے تو پھر باقی کیوں نہیں لے سکتے؟ میں اس کے نمبروں کو Reference (حوالہ) بنا کر باقی اسٹوڈنٹس کی ریلیٹو مارکنگ کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے میرے نمبر 9 کے بجائے 90 کر دیے، جس کے 8 تھے اس کے 80 کر دیے اور جس کے 7 تھے اس 70 کر دیے۔ اس طرح کلاس کے اکثر اسٹوڈنٹس پاس بھی ہو گئے اور خوش بھی ہو گئے۔ کلاس کا کوئی بچہ بھی ان کے اس سوال کا جواب نہیں دے پا رہا تھا کہ اگر میرے اس پیپر میں ایک بچہ 100 میں سے 9 نمبر لے سکتا ہے تو باقی بچوں نے 9 نمبر کیوں نہیں لیے؟ ہمارے پاس ان کے اس سوال کا کوئی

جواب نہیں تھا۔ یوں ہمارے ذہن میں Relative Marking (تقابلی نمبرنگ) کا ایک نیا Concept (تصور) آیا۔

قیامت کے دن Relative Marking (تقابلی نمبرنگ):

بعد میں ہم نے حدیث پاک میں پڑھا کہ قیامت کے دن بھی معاملہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ رب العزت ایک آدمی کو کھڑا کریں گے اور فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے اپنی زندگی میں دین کے لیے کیا کام کیا؟ وہ کہے گا: یا اللہ! میں فلاں ملک کا چیف ایگزیکٹو تھا...... میں تو پرائم منسٹر تھا...... میں تو بادشاہ تھا...... میں تو صدر تھا...... اور اتنے مسائل تھے کہ میں ساری زندگی انہی میں اُلجھا رہا، میں کیا کر کے آتا؟ اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمائیں گے کہ وہ کھڑے ہو جائیں۔ پھر اس بندے کو مخاطب ہو کر فرمائیں گے: یہ بھی میرے بندے تھے، ان کے پاس انسانوں کی بادشاہت بھی تھی، جنوں کی بادشاہت بھی تھی، پھر خشکی اور تری کی مخلوقات کی بھی بادشاہت تھی، اگر یہ اتنی بڑی بادشاہت کے باوجود میری فرمانبرداری کرنے والے تھے تو تم نے میری فرمانبرداری کیوں نہ کی؟ اس وقت وہ بندہ اللہ رب العزت کے سامنے لاجواب ہو جائے گا۔

ایک بندے سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم نے کیا کیا؟ وہ کہے گا: یا اللہ! میں ٹی۔ بی۔ کا مریض تھا، ہر وقت کھانستا رہتا تھا، میں کیا کرتا؟ مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت ایوب علیہ السلام کو کھڑا کریں گے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو آزمایا، ان کی بیماری ایسی تھی کہ ان کی زبان کے علاوہ ان کا پورا جسم ہی اس بیماری سے متاثر تھا۔ اللہ اس بندے کو فرمائیں گے کہ انہوں نے اس بیماری کے باوجود میری اتنی عبادت کی کہ میں نے قرآن پاک میں فرما دیا:

﴿اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۝ نِعْمَ الْعَبْدُ ۝ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۴۴﴾ (ص:۴۴)

اگر یہ اس بیماری کے باوجود اتنی نیکی کر کے آئے تو تم نے نیکی کیوں نہ کی؟ یہ ریلیٹو مارکنگ ہے اور واقعی یہ Comparison (موازنہ) کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔

ان واقعات سے یہ بھی پتا چلا کہ قیامت کے دن کوئی یہ بہانہ نہ بنا سکے گا کہ یا اللہ! میری ڈیوٹی ایسی تھی، میرا بزنس ایسا تھا، میری مصروفیت ایسی تھی کہ میں تو دین کے لیے کچھ کر ہی نہیں سکا تھا۔ اللہ تعالیٰ دین پر چلنے والے بندوں کو مثال کے طور پہ پیش فرما دیں گے۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہر دور میں اور ہر زمانے میں قدسی روحیں موجود ہوتی ہیں جو نیکی پہ زندگی گزارتی ہیں، وہ دنیا کے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں اور دین کے تقاضے بھی۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا واقعہ:

ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ۔ انڈیا کے دارالحکومت دہلی میں ان کے نام پر قطب مینار بھی بنا ہوا ہے۔ وہ وقت کے بادشاہوں کے شیخ کہلاتے تھے۔

ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے والدین نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم ہونے والے بچے کو نیک کیسے بنائیں گے؟ ہم اس کے لیے کیا کیا کریں گے؟ اس سلسلے میں ماں نے بھی تجویزیں پیش کیں اور باپ نے بھی تجویزیں پیش کیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک لائن طے کر لی کہ ہم اپنے بچے کو ایسا بنائیں گے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کوزیادہ بھریں گے اور وہ بہت ہی نیک بنے گا۔

جب بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام "قطب الدین" رکھا گیا۔ جب وہ بچہ مدرسہ جانے

کے قابل ہوا تو قریب ہی ایک مدرسہ میں بچے کو پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔ جب بچہ مدرسہ سے واپس آیا تو اس نے کہا: امی! مجھے بھوک لگی ہے، کھانا دیں۔ ماں نے کہا: بیٹا! ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کھانا دیتے ہیں، تم بھی اللہ تعالیٰ سے کھانا مانگو، وہ تمہیں بھی عطا کریں گے۔ بیٹے نے پوچھا: امی! کیسے مانگوں؟ ماں نے کہا: یہ دیکھو، یہ مصلّٰی ہے، اس کو بچھاؤ، اس پر بیٹھو، اور ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگو۔ تو بچے نے مصلّٰے پر بیٹھ کر ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی: اے اللہ! میں ابھی مدرسے سے آیا ہوں، تھکا ہوا ہوں، آپ میرے امی ابو کو بھی کھانا دیتے ہیں، مجھے بھی کھانا دیں۔ اس نے دعا مانگنے کے بعد کہا: امی! اب کیا کروں؟ ماں نے کہا: بیٹا! کمرے میں جاؤ، وہاں سے ڈھونڈو، کہیں کھانا پڑا ہوگا۔ دراصل ماں نے گرم گرم روٹی کہیں چھپائی ہوئی تھی، جب بچے نے ادھر ادھر سے تلاش کی تو اس کو روٹی مل گئی۔

اب یہ اس کا روزانہ کا معمول بن گیا کہ بچہ مدرسے سے آتا، پھر دعا مانگتا اور کھانا تلاش کرتا۔ اس طرح اسے کھانا مل جاتا۔ اب اس کے ذہن میں بہت سارے سوالات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ وہ ماں سے پوچھتا: امی! اللہ تعالیٰ سب کو کھانا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنے بڑے ہیں، اللہ تعالیٰ کے پاس اتنے خزانے ہیں، وہ اتنے پیار کرنے والے ہیں۔ جب ماں دیکھتی کہ میرا بیٹا اللہ کے بارے میں اتنے اچھے سوالات محبت سے پوچھ رہا ہے تو اس کو بہت خوشی ہوتی کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہورہی ہے۔

یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا تھا کہ ایک دن والدہ کو رشتہ داروں کے ہاں کسی تقریب میں جانا پڑا۔ وہاں اس کو وقت زیادہ لگ گیا۔ اسے توقع یہی تھی کہ میں گھر جا کر بچے کے آنے سے پہلے پہلے کھانا پکا لوں گی، مگر جب اس نے وقت دیکھا تو وقت زیادہ

ہو چکا تھا۔اس بات سے وہ بڑی گھبرائی کہ آج میرا بچہ آئے گا اور اگر اس کو کھانا نہ ملا تو اس کا جو یقین بن رہا تھا، وہ ٹوٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ روتی روتی گھر واپس آئی، گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ بچہ سویا ہوا تھا، وہ بہت خوش ہوئی کہ یہ سویا ہوا ہے، میں جلدی جلدی کھانا بنا لیتی ہوں۔

اس نے کھانا بنا کر اسی طرح کہیں چھپا دیا۔ پھر آ کر بچے کو پیار کیا اور جگا کر کہا: بیٹا! آج تو تمہیں بہت بھوک لگی ہوگی، اُٹھو، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ کر کھانا ڈھونڈو۔ بچہ اُٹھا اور کہنے لگا: اماں میں مدرسے سے آیا تھا آپ بھی گھر میں نہیں تھیں، میں نے مصلیٰ بچھا کر دعا مانگی تھی اور میں نے یہ بھی کہا تھا: اے اللہ! آج تو اماں بھی گھر پر نہیں ہیں، آپ مجھے کھانا کھلا دیجیے۔ اماں! پھر میں کھانا ڈھونڈنے کے لیے کمرے میں گیا تھا، مجھے ایک جگہ روٹی پڑی ہوئی مل گئی تھی، میں نے وہ اُٹھا کر کھالی، لیکن جو مزا مجھے آج آیا ہے، وہ مزا روٹی کھانے میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

روٹی کو ہندی زبان میں ''کاکی'' کہتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کی وجہ سے ان بزرگوں کے نام کے ساتھ ''کاکی'' کا لفظ لگ گیا۔ آج دنیا ان کو قطب الدین بختیار ''کاکی'' کے نام کے ساتھ یاد کرتی ہے۔

پھر جب وہ بڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ولایت کے بڑے مقام پر فائز کیا۔ حتیٰ کہ وقت کے بادشاہ بھی ان کے مرید تھے۔ پھر عوام الناس کا کیا کہنا، وہ تو اور بھی زیادہ گرویدہ تھے۔

بادشاہِ وقت کی تقویٰ بھری زندگی:

جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو ان کا جنازہ ایک

بڑے گراؤنڈ میں لایا گیا۔ ان کا جنازہ پڑھنے کے لیے لاکھوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جب جنازہ لاکر رکھا گیا تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

حضرت نے مجھے ایک وصیت کی تھی۔ میری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ میں وہ وصیت سارے مجمع کے سامنے سناؤں، تا کہ اس پر عمل ہو سکے۔

چنانچہ سب مجمع متوجہ ہو گیا۔ اس نے وصیت پڑھ کر سنائی کہ حضرت نے فرمایا ہے: میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی زندگی میں چار خوبیاں ہوں:

1 ......ایسا نیک انسان جس کی فرض نماز کی تکبیرِ اُولیٰ کبھی بھی قضا نہ ہوئی ہو۔ تکبیرِ اولیٰ سے مراد یہ ہے کہ جب امام شروع میں اللہ اکبر کہتا ہے، تو وہ عین اسی وقت جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھے۔ اب ہم اگر اپنی زندگیوں پر غور کریں تو ہم اس شرط میں فیل ہیں۔ کئی مرتبہ جماعت سے نماز رہ جاتی ہے یا رکعتیں رہ جاتی ہیں اور تکبیرِ اُولیٰ نہیں ملتی۔

2 ......اس کی تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔ اس دوسری شرط کے آئینے میں اگر ہم اپنے آپ کو دیکھیں تو ہم پھر فیل ہوتے ہیں۔ انسان ہیں، سفر، حضر، صحت، بیماری، کئی طرح کے حالات پیش آتے ہیں۔ اگر تہجد پڑھتے بھی ہیں تو کئی مرتبہ رہ بھی جاتی ہے۔

3 ......وہ اتنا عبادت گزار ہو کہ اس نے عصر کی سنتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں۔ اب اگر تیسری شرط کو دیکھیں تو اس میں بھی ہم سب فیل ہیں۔

4 ......اس نے اپنی زندگی میں کسی غیر محرم کو شہوت کی نگاہ سے نہ دیکھا ہو۔

جب یہ شرائط پڑھ کر سنائی گئیں تو گویا پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ لوگ حیران تھے کہ کس بندے میں یہ صفات ہوں گی اور کون اس کا جنازہ پڑھائے گا۔

تھوڑی دیر تو خاموشی رہی۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی روتا ہوا آگے بڑھا اور حضرت ﷫ کے پاس آیا اور ان کے چہرے کے قریب آ کر کہا: حضرت! آپ تو

وفات پا گئے، مگر میرے راز کو آپ نے فاش کر کے مجھے رُسوا کر دیا۔ پھر اس نے پورے مجمع کے سامنے اللہ کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا کر کہا: میرے اندر یہ چاروں شرائط موجود ہیں۔ پھر اس نے حضرت کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ وقت کا بادشاہ سلطان التمش تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر وقت کا بادشاہ ایسا ہوسکتا ہے کہ اس کی تکبیر اولیٰ قضا نہ ہو، اس کی تہجد قضا نہ ہو، عصر کی سنتیں قضا نہ ہوں اور وہ غیر محرم پر بُری نظر نہ ڈالے، تو دوسرے لوگ قیامت کے دن کیسے بہانہ کریں گے کہ جی! ہم تو ایسے وقت میں پیدا ہوئے کہ ہم تو گناہ سے بچ ہی نہیں سکتے تھے۔ بھئی! بچنے والوں نے ایسے ایسے مقام پر زندگی گزاری اور گناہوں سے بچ کے دکھایا۔ یہ لوگ قیامت کے دن ہمارے لیے ریفرنس بن جائیں گے۔

آج کے زمانے میں اگرچہ دنیا کے اندر عریانی اور فحاشی بہت عام ہوتی جارہی ہے۔ مگر ایسے لوگ بھی اس زمانے میں بھی موجود ہیں جو نیکی اور تقویٰ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر یہ قدسی روحیں نہ ہوتیں تو شاید اللہ تعالیٰ دنیا کی بساط کو لپیٹ کے ہی رکھ دیتے۔ ہم اپنے بعض قریبی لوگوں کو دیکھتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ کرنے والے کتنی جدوجہد کرتے ہیں۔

ایک قابل ترین ڈاکٹر کا دین میں آگے بڑھنا:

ہمارے ایک قریبی ساتھی ہیں۔ انہوں نے شکاگو سے میڈیکل سائنسز میں ڈگری لی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ دین پڑھوں اور دین کو بھی ساتھ لے کر چلوں۔ ہم نے کہا: بہت اچھا، اس کے لیے آپ کو تین چار سال کا وقت فارغ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ انہوں نے اپنے ڈین سے بات کی۔ انہوں نے اسے کہا: جی! یہ میرا اب تک کا ریکارڈ ہے، میں چاہتا ہوں کہ اب میں Research Work (تحقیقی کام) کروں۔ ڈین نے پوچھا: کون سا کام؟ انہوں نے کہا: دیکھیں! مسلمانوں کے پیغمبر علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں، یعنی احادیث میں سائنس کے کچھ عنوانات پر بھی گفتگو کی ہے، میں ان باتوں پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں کہ اب تو موسٹ ماڈرن سائنس کا زمانہ ہے، ان کی جو سائنس سے متعلق باتیں تھیں، میں ان کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: بہت اچھا۔ چنانچہ ڈین نے کہا: ہم آپ کو چار سال کے لیے فارغ کر دیتے ہیں اور آپ جب چار سال کے بعد آئیں گے تو آپ یہیں سے اپنا کام شروع کر سکیں گے۔

جب ان کو چار سال کا وقت مل گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا: جی! اب میں کیا کروں؟ میں نے کہا: آپ ہمارے پاس آجائیں، ہم آپ کو آٹھ سال کا کورس چار سال میں کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان کے لیے ٹیچرز کا انتظام کیا اور ان ٹیچرز کو بتایا کہ یہ بندہ بہت ہی ہائی لیول کا ہے، علمائے کرام بخاری شریف کا جو کورس آٹھ سال میں کرتے ہیں وہ آپ نے ان کو چار سال میں پڑھا دینا ہے۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا۔

اللہ کی شان دیکھیں کہ انہوں نے بخاری شریف تک کا کورس مکمل چار سال کے بجائے تین سال میں کرلیا۔ اس نے ایک ایک کتاب سبقاً سبقاً پڑھی۔ شیخ الحدیث صاحب فرماتے تھے: میں نے اپنی زندگی میں اتنا ذہین انسان کبھی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فوٹوگرافک میموری دی ہوئی ہے۔ مگر یہ تو جب دل کے اندر طلب ہوتی ہے تب فوٹوگرافک میموری کام کرتی ہے، ورنہ تو انسان کی عقل پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔

جب انہوں نے یہ کام مکمل کیا تو مجھ سے پوچھا: جی! اب میں کیا کروں؟ میں نے

کہا: آپ بتائیں۔ کہنے لگے: جی! میرے پاس ایک سال ہے، مجھے قرآن پاک حفظ کرنے کا بہت شوق ہے، میں یہ کرلیتا ہوں۔ میں نے کہا: بہت اچھا۔ اللہ کی شان کہ انہوں نے آٹھ مہینے کے اندر پورا قرآن پاک حفظ کرلیا۔ پھر اس کے بعد کہنے لگے: جی! اب میں کیا کروں؟ میرے پاس چار مہینے ہیں، میں نے کہا: آپ سفر میں بھی میرے ساتھ رہیں اور رمضان المبارک کے اعتکاف میں بھی میرے ساتھ رہیں تا کہ آپ ذکر وسلوک کے اسباق میں بھی آگے بڑھ جائیں۔ اللہ کی شان کہ انہوں نے چار مہینے بہت اچھا ذکر و مراقبہ کیا، ان کی کیفیات بہت اچھی تھیں، اس طرح میں نے رمضان المبارک کے بعد ذکر وسلوک میں اجازت وخلافت بھی دے دی۔

اب انہوں نے چار سال میں گویا تین ڈگریاں حاصل کرلیں۔ ایک تو وہ باضابطہ عالم بھی بن گئے، دوسرا حافظ بھی بن گئے اور تیسرے نمبر پر ان کو سلسلہ عالیہ کی اشاعت کی اجازت بھی مل گئی۔ پھر مجھے کہنے لگے: جی! اب میں کیا کروں؟ میں نے کہا: بس آپ واپس جائیں، وہی ڈاکٹری والی لائن کو دوبارہ اپنانا ہے اور ساتھ ساتھ دین کا کام بھی کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ واپس امریکہ چلے گئے۔

امریکہ میں جب کوئی ڈاکٹر اپنی پریکٹیکل لائف میں داخل ہونے لگتا ہے تو اس کو ایک امتحان دینا پڑتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں U.S.M.L.A.Test یہ ٹیسٹ اتنا مشکل ہوتا ہے کہ بہت لوگ رو رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے پاکستان سے جانے والے ڈاکٹر تیسری ٹرائی میں، چوتھی، پانچویں یا چھٹی ٹرائی میں پاس ہوتے ہیں۔ بلکہ میں نے ایک ڈاکٹر کو دیکھا جس نے نو دفعہ ٹرائی کی، پھر جا کر پاس ہوا۔ وہ اتنا مشکل ٹیسٹ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بہت پریشان ہوتے ہیں کہ یہ ٹیسٹ کیسے پاس کریں؟

ان کو بھی وہ ٹیسٹ پاس کرنا تھا...... اللہ کی شان کہ چار سال کا Gap (وقفہ) بھی اور وہ ٹیسٹ بھی دینا تھا...... وہ ٹیسٹ چھ گھنٹے کا ہوتا ہے، اس میں 1800 سوالات ہوتے ہیں۔ وہ سوالات اتنے عجیب ہوتے ہیں کہ ان کا جواب سوچ کر دینے میں ہی لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے وہ چھ گھنٹے کا ٹیسٹ دیا اور اتنے نمبر لیے کہ امریکہ کی تاریخ میں کسی اور بندے نے اتنے نمبر نہیں لیے تھے۔ انہوں نے 1800 میں سے 1800 نمبرز حاصل کیے۔ امریکہ کے اندر یہ ریکارڈ ہے کہ ایک مسلمان نوجوان جس کی Origin (اصلیت) بھی کسی باہر کے ملک سے تھی، اس نے U.S.M.L.A.Test میں 1800 میں سے 1800 نمبر لیے۔

پھر جب رزلٹ اناؤنس ہوا تو اس ملک کے تین بڑے بڑے ہاسپٹلز نے ان کو فرسٹ جاب کی آفر کردی۔ چنانچہ ان کو فرسٹ جاب ملی، اڑھائی لاکھ ڈالر۔ 2.5 لاکھ ڈالر پر ان کی جاب اسٹارٹ ہوئی۔ اس وقت وہ نوجوان ڈی این اے کے ذریعے کینسر کے علاج پر ریسرچ کر رہا ہے۔

اب آپ غور کریں کہ وہ نوجوان ہے اور امریکا جیسے ملک میں رہ رہا ہے، وہاں پر گناہوں کے راستے پر جانے کے لیے اسے کیا رکاوٹ ہے؟ مگر اس نے دین بھی پڑھا، حفظ بھی کیا، اس نے ذکر و سلوک بھی سیکھا، وہ تہجد گزار بھی ہے اور اس نے ساتھ ساتھ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو بھی پورا کیا۔ یہی نہیں کہ وہ فارغ بیٹھا ہوا ہے بلکہ ایک ایسا ریسرچ ورک کر رہا ہے جو دنیا میں اور کہیں نہیں ہو رہا۔

ایسے لوگ قیامت کے دن ہمارے لیے ایک ریفرنس بن جائیں گے کہ اگر انہوں نے اسی ماحول میں رہتے ہوئے دین کے لیے اتنا کچھ کیا تھا تو تم نے کیوں نہ کیا، اور ہمارے پاس قیامت کے دن کوئی جواب نہیں ہوگا۔

مزدور کا جنت میں داخلہ آسان:

دیکھیں! اگر قیامت کے دن ایک مزدور سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے دین کے لیے کیا کچھ کیا؟ وہ کہے گا: یا اللہ! میرے چھ بچے تھے اور میری ماہانہ تنخواہ دوسو دینار تھی، میں مزدور آدمی تھا، سارا دن چیزیں اُٹھا اُٹھا کر رکھتا تھا، میں مشکل سے بچوں کے لیے اتنا کما کر لاتا تھا اور دن بھر کا تھکا ہوا ہوتا تھا جس کی وجہ سے جلدی سے سو جاتا تھا۔
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ٹھیک ہے، تم نے بچوں کو پالا تھا، چلو تم جنت میں چلے جاؤ۔

پھر اس کی بیوی اللہ تعالیٰ کے حضور جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے: تم نے دین کے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گی: یا اللہ! میں چھ بچوں کی ماں تھی، گھر میں کوئی ہیلپ کرنے والی نہیں تھی، میں ہی باورچن تھی، میں ہی دھوبن تھی اور میں ہی بھنگن تھی، گھر کے چھوٹے بڑے سب کام مجھے سمیٹنے تھے، بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی، خاوند کی ذمہ داریاں بھی میں ادا کرتی تھی اور میں کیا کرتی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا! تو نے چھ بچوں کو پالا تھا، چل تو بھی جنت میں چلی جا۔

ڈگریوں والے مشکل میں:

البتہ جب ایسے لوگ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں جائیں گے جو آج کل ڈاکٹر اور انجینئر کہلاتے ہیں اور کہتے ہیں: جی! ہم نے دنیا میں بڑی تعلیم حاصل کی، ہم بڑی اچھی جاب کر رہے ہیں، ہماری بڑی اچھی تنخواہیں ہیں اور بہت سی دوسری مراعات بھی حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے: اے میرے بندو! تم نے میرے دین کے لیے کیا کیا؟ وہ کہیں گے: یا اللہ! ہمیں تو ٹائم ہی نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا! تمہارے پاس بہترین گھر بھی تھا، بہترین گاڑی بھی تھی، مَن پسند کی بیوی تھی، تمہارے

گھر میں ڈرائیور بھی تھا اور تمہارے گھر میں نوکرانی بھی تھی، میں نے تمہیں یہ ساری نعمتیں دی تھیں، اس کے باوجود تم میرے دین کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے، تم وقت پر نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ بتاؤ! اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

پھر اس کی بیوی آگے آئے گی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم نے میرے دین کے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گی: یا اللہ! میں تو نماز بھی نہیں پڑھ پاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: کیوں؟ وہ کہے گی: یا اللہ! میرے تین بچے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تمہارے خاوند کی تنخواہ اتنی تھی اور تمہارے گھر میں ہر سہولت تھی، تمہارے کچن میں الگ نوکرانی تھی، صفائی کے لیے الگ نوکرانی تھی، کپڑے دھونے کے لیے الگ نوکرانی تھی، اب اتنی آسائشوں کے باوجود تمہیں فرض نمازوں کی بھی توفیق نہیں ملتی تھی؟ تم نے یونیورسٹی میں گریجوایشن اور ماسٹرز کی ڈگری بھی لے لی تھی، اگر تم کمپیوٹر سائنسز پڑھ سکتی تھی تو کیا تم نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا؟ وہ کیا جواب دے گی؟ کیا وہ یہ کہے گی کہ مجھے قرآن مجید پڑھنا ہی نہیں آتا تھا؟ تو ہم جیسے وہ لوگ جو اتنی اتنی ڈگریاں لے چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں ٹریلینز آف برین سیلز دیے ہیں۔ ہم قیامت کے دن لاجواب ہو جائیں گے اور کہیں گے: یا اللہ! ہم نے واقعی سستی کی، ورنہ ہم آپ کا دین بھی پڑھ سکتے تھے، سیکھ سکتے تھے اور اس کے مطابق زندگی گزار سکتے تھے۔

وقت کو منظّم کرنے سے آسانی:

واقعی اگر آج ہم اپنے ٹائم کو ذرا منظم کرلیں تو ہم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے نیند کے نکال لیجیے...... ویسے تو سائنٹیفک ریسرچ یہ ہے کہ سات گھنٹے کی نیند ہر بندے کے لیے سب سے زیادہ موزوں نیند ہوتی ہے، اس سے کم ہو تو بھی ہارٹ اٹیک کا اندیشہ ہوتا ہے اور اگر سات

گھنٹے سے زیادہ ہو تو بھی ہارٹ اٹیک کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں۔

Seven hour's sleep is the best time for human being.

اس بات پر دنیا کی یونیورسٹیوں کے سائنس دان متفق ہو چکے ہیں...... ہم کہتے ہیں کہ چلو سات گھنٹے کے بجائے آٹھ گھنٹے ہی سہی، تو آٹھ گھنٹے سونے کے لیے نکال دیں۔ ان آٹھ گھنٹوں کے بعد ڈیوٹی کے آٹھ گھنٹے نکال دیں۔ سولہ گھنٹے تو یہ نکل گئے۔ اس کے بعد کے آٹھ گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ دفتر آنے جانے کا نکال دیں۔ باقی سات گھنٹے بچتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم یہ سات گھنٹے کیسے گزارتے ہیں؟ اگر آپ غور کریں تو وہ سات گھنٹے اکثر دوستوں سے فون پر بات کرتے ہوئے یا گھر کے اندر ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہوئے یا انٹرنیٹ پر بیٹھ کر یا کوئی ای میل ریسرچ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ یعنی وہ سات گھنٹے ہم اپنی مرضی سے گزارتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ سات گھنٹے ہماری زندگی میں کتنے اہم ہیں۔ اگر ہم ان سات گھنٹوں کو فضول گزارنا چھوڑ دیں اور ان میں سے دو تین گھنٹے روزانہ نکال کر کسی عالم سے رابطہ کر لیں اور ان سے ہم اپنے گھر میں ہی پڑھنا شروع کر دیں تو ہم آسانی سے دین بھی پڑھ سکیں گے اور آسانی سے عبادات بھی کر سکیں گے۔

ایک ممتاز سرجن کی نماز کی پابندی:

ہمارے ایک قریبی تعلق والے دوست ہیں۔ وہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں، وہ امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے...... امریکا میں ایک یونیورسٹی کے اندر ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے، اور وہ بھی کسی کا بیرون ملک سے جا کر...... وہ بہت ہی ذہین و فطین آدمی ہیں۔ اللہ کی شان کہ ان کو حکومت نے گھر

کے ساتھ دوملین ڈالر لگا کر ان کی پرسنل ریسرچ کے لیے ایک لیبارٹری بنا کر دی تھی۔

وہ مجھے بتانے لگے: حضرت! میں کڈنی ٹرانسپلانٹ کرتا ہوں، اور بسا اوقات مجھے کڈنی ٹرانسپلانٹ میں نو گھنٹے بھی لگ جاتے ہیں۔ مجھے ان نو گھنٹوں میں بہت ہی توجہ سے کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہنے لگے: اتنی مصروفیت کے باوجود آج تک میری زندگی میں کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا: نو گھنٹے آپریشن کے دوران کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے: جی! میں آپریشن کے دوران بھی نماز پڑھتا ہوں۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ کہنے لگے: میں ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتا ہوں، جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو میں آپریشن کو ایسے پوائنٹ پر پہنچا دیتا ہوں کہ میں اپنے ساتھ والے باقی لوگوں کو کہہ دیتا ہوں کہ آپ یہ کریں، آپ یہ کریں، میں تھوڑی دیر کے بعد پھر آجاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں باہر نکلتا ہوں، اپنے دستانے اُتار دیتا ہوں، وہیں آپریشن تھیٹر کے اندر ہی کپڑا بچھا ہوتا ہے، اس پر میں نماز پڑھ لیتا ہوں اور پھر دوبارہ ہاتھ دھو کر اور دستانے پہن کر آتا ہوں اور دوبارہ آپریشن شروع کر دیتا ہوں۔

اگر ایک سرجن نو گھنٹے کے آپریشن کے دوران اپنی نماز قضا نہیں ہونے دیتا اور ہم اپنے گھر میں ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں، صوفوں پر آرام سے بیٹھے جو چائے پی رہے ہوتے ہیں اور نمازیں قضا کر دیتے ہیں، تو ہم قیامت کے دن اللہ رب العزت کو کیا جواب دیں گے؟ اس لیے آج کے دن صرف اس پوائنٹ پر سوچنا ہے کہ ہم اپنے ٹائم کو Manage (منظّم) کیسے کریں۔

دین و دنیا میں توازن:

ہم نعرہ تو لگاتے ہیں کہ دین دنیا برابر برابر، مگر ہم دین کو ساتھ لے کر نہیں چلتے، دنیا ہی چل رہی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی کام ہوتا ہے تو ہم راتوں کو بھی جاگ جاتے

ہیں......ہم سفر بھی کر لیتے ہیں......ہم کھانا بھی چھوڑ دیتے ہیں......ہم دنیاوی لحاظ سے ہر کام کو اچھے طریقہ سے کر کے دکھا دیتے ہیں...... ہم ہر اسائنمنٹ کو پورا کر دیتے ہیں......لیکن جب دین کی بات آتی ہے تو ہم بیمار بھی بن جاتے ہیں، لاغر بھی بن جاتے ہیں، کمزور بھی بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں: جی! ہم تو یہ بھی نہیں کر سکتے اور یہ بھی نہیں کر سکتے۔ایسے نظر آتا ہے جیسے ہم واقعی دین کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کو ضروری نہیں سمجھ رہے ہوتے۔حالانکہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: بتاؤ! تم نے دنیا میں میرے لیے کتنا وقت گزارا، دین کے لیے کیا کیا؟

اس لیے آج اس بات کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی زندگی کے اوقات کو اس طرح Manage (منظم) کریں کہ ہم حقوق العباد کو بھی پورا کریں اور حقوق اللہ کو بھی پورا کریں۔اچھا انسان وہی ہے، جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پورا کر کے گزارتا ہے۔دنیا میں تو ہم امتیازی نمبر لے کر پاس ہونے والے لوگ ہیں، اگر ہمیں قیامت کے دن کھڑا کر کے یہ کہا گیا کہ تم نے یہ بھی نہ کیا، یہ بھی نہ کیا، تو یاد رکھنا کہ قیامت کی ذلت سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہو سکتی۔

سبحان اللہ کے ثواب کا حساب:

آپ سب لوگ انجینئرز ہیں، میں انجینئر ہونے کی وجہ سے ایک چھوٹی سی Calculation (حساب) آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ، غُرِسَتْ لَهُ نَخْلَةٌ فِي الْجَنَّةِ)) [جامع ترمذی، حدیث: ۳۴۶۴]

''جو بندہ ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں ایک درخت لگا دیتے ہیں۔''

وہ درخت اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دوسری حدیث مبارکہ میں ہے:

((إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً، يَسِيرُ الرَّاكِبُ الْجَوَادَ الْمُضَمَّرَ السَّرِيعَ مِائَةَ عَامٍ مَا يَقْطَعُهَا)) [صحیح بخاری، حدیث: ۶۵۵۳]

''جنت میں ایک درخت ہوگا کہ (اس کے سایہ میں) تیز رفتار، پھرتیلے گھوڑے پر سوار سو سال تک چلے تو پھر بھی اس کا سفر ختم نہ ہوگا۔''

یعنی سبحان اللہ کہنے پر جنت میں اتنا بڑا درخت لگا دیا جاتا ہے۔

ایک دن مکہ مکرمہ میں بیٹھے ہوئے ذہن میں خیال آیا کہ ہم ذرا حساب کر کے دیکھیں تو سہی کہ وہ درخت کتنا بڑا ہوگا؟ پھر خیال آیا کہ

- جانوروں میں چیتا سب سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ جب وہ اپنے شکار کا تعاقب کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کی سپیڈ 90 میل فی گھنٹہ تک چلی جاتی ہے۔
- شیر 80 میل فی گھنٹہ تک چلا جاتا ہے۔ اور
- ریکارڈ بنانے والے گھوڑے عام طور پر 80 سے 85 میل فی گھنٹہ تک چلے جاتے ہیں۔

چلیں! ہم گھوڑے کی کم سپیڈ لے لیتے ہیں۔ فرض کریں 50 میل فی گھنٹہ کی سپیڈ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ 24 گھنٹوں میں 1200 میل تو آرام کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایک دن میں 1200 میل طے کر سکتا ہے تو پھر ایک مہینے میں کتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ 36000 میل۔ یعنی اگر ایک گھوڑا مستقل ایک مہینہ دوڑتا رہے تو وہ 36000 میل کا فاصلہ آرام سے طے کر سکتا ہے۔ پوری دنیا کا Circumference (محیط) 24000 میل ہے اور زمین کی سپیڈ 1000 میل فی گھنٹہ ہے۔ اس لیے زمین

24 گھنٹے میں اپنا چکر پورا کرتی ہے، اور دن رات کا نظام چل رہا ہوتا ہے۔ اگر 24 گھنٹوں میں 24000 میل طے ہو جاتے ہیں تو 36000 میل ڈیڑھ دن میں طے ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مہینے میں 36000 میل جو اس نے طے کیے تو گویا ڈیڑھ زمین طے ہو سکتی ہے۔ تو ایک سال میں اٹھارہ زمینوں کے برابر فاصلہ ہوگا۔ اگر ایک سال میں اٹھارہ زمینیں ہو سکتی ہیں تو سو سالوں میں کتنی زمینیں ہو جائیں گی؟ 18x100=1800 یعنی 1800 زمینیں۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ اگر مکہ مکرمہ میں کوئی عبادت کی جائے تو وہاں پر عبادت کا اجر ایک لاکھ گنا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مِائَةُ أَلْفِ صَلَاةٍ))

[شعب الایمان للبیہقی، حدیث: ۴۱۴۴]

لہٰذا اگر کوئی مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھتا ہے تو اس کو ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے۔ اگر ہم ایک لاکھ کو 1800 سے ضرب دیں تو ایک دفعہ سبحان اللہ پڑھنے پر 180 ملین زمینیں بنتی ہیں۔

وسیع و عریض جنت کس قیمت پر؟

اب آپ مجھے بتائیں کہ آپ ساری زندگی انجینئرنگ کریں گے، اتنی محنت کریں گے اور ساری زندگی کی بچت آخر پر جا کر کیا ہوگی؟ آپ دو کنال کا مکان کسی اچھی سی جگہ پر بنا لیں گے۔ اب ساری زندگی کی بچت کے بعد دو کنال کا مکان بن رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اتنے مہربان ہیں کہ ایک دفعہ سبحان اللہ کہنے پر جنت کے اندر 180 زمینوں کے برابر رقبہ دے رہے ہیں۔ آپ نے دنیا میں کوئی اتنا سستا پلاٹ دیکھا ہوگا۔ اس

دن ہم حسرت کریں گے کہ اے اللہ! اگر اتنی سستی جنت مل رہی تھی تو ہم نے دنیا میں کیوں نہ کمائی۔ لیکن ہم نے اس لیے نہ کمائی کہ ہم نے عقل کو استعمال نہیں کیا تھا۔ ہماری عقل صرف دنیا میں چلتی ہے، دین میں نہیں چلتی۔ آج ہم اپنی اس کوتاہی کو سوچیں اور اس کے بعد ارادہ کریں کہ یا اللہ! ہم آج کے بعد اپنے ٹائم کو صحیح استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اور اسی دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی تیاری کریں گے۔

آپ ذرا یہ بتائیں کہ جب آپ گھر سے اپنے دفتر کے لیے چلتے ہیں تو آپ کو آدھا گھنٹہ پندرہ منٹ تو لگتے ہی ہیں۔ اب اس وقت میں کیا کرنا ہوتا ہے؟ گاڑی ڈرائیو کرنی ہوتی ہے نا۔ بھئی! زبان سے تو گاڑی ڈرائیو نہیں ہوتی، آپ زبان سے کلمہ بھی پڑھ سکتے ہیں، سبحان اللہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ چیزیں پڑھنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

ایک نوجوان کا قابلِ رشک دینی جذبہ:

ہمارے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے دورۂ حدیث کیا۔ ان کا اس عاجز سے اصلاحی تعلق تھا۔ جب انہوں نے امتحان دے دیا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے: حضرت! مجھے فٹ مساج کا بہت اچھا طریقہ آتا ہے، یہ میرے والد کا Profession (پیشہ) ہے، میں ان کے اس کام میں ہیلپ کرتا ہوں، اگر آپ مجھے روزانہ آدھا گھنٹہ دے دیا کریں تو میں روزانہ آپ کے پاؤں کا مساج کر دیا کروں گا، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ بیٹھ بیٹھ کر آپ کے پاؤں پر سوجن سی ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا: بہت اچھا۔

جب انہوں نے پہلے دن مساج کیا تو مجھے بھی کافی سکون ملا، کیونکہ وہ پریشر پوائنٹس پر مساج کر رہے تھے۔ مجھے چوتھے پانچویں دن ایک ساتھی نے بتایا: حضرت! یہ یہاں ہمارے پاس نہیں رہتے، یہ لاہور سے روزانہ آتے ہیں، آپ کو آدھا

گھنٹہ دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر بس میں بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ میں نے ان کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے کہا: جی حضرت! دراصل والد صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی، کیونکہ مجھے ان کی ہیلپ کرنا ہوتی ہے، اس لیے میں بس پر بیٹھ کر یہاں آتا ہوں، مجھے تین گھنٹے لگتے ہیں، آپ آدھا گھنٹہ مجھے دیتے ہیں اور میں فٹ مساج کر کے پھر واپس چلا جاتا ہوں۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ ایک نوجوان صرف آدھے گھنٹے کے لیے اتنا سفر کر کے آتا ہے۔

میں نے ان سے کہا: اب رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے، آپ اپنے ابو کو میری طرف سے میسج دے دیں کہ وہ آپ کو رمضان المبارک کے مہینے میں فارغ کر دیں اور آپ رمضان المبارک میں اعتکاف ہمارے پاس گزاریں۔ انہوں نے جب بات کی تو والد صاحب نے اجازت دے دی۔ وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے: جی حضرت! اب میں رمضان المبارک میں کیا کروں؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم تو دے دیا، پھر آپ نے افتاء بھی کر لیا، اب آپ قرآن پاک حفظ کر لیں۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا۔ یہ آج کے زمانے کی بات ہے، اللہ کی شان دیکھیں کہ وہ نوجوان روزانہ ایک پارہ یاد کرتا تھا اور رات کو تراویح میں سناتا تھا۔ اٹھائیس دن میں اس نوجوان نے پورا قرآن مجید یاد کر لیا۔ اگر آج کے دور میں ایک نوجوان اٹھائیس دن میں قرآن مجید مکمل یاد کر سکتا ہے تو ہم سے بھی تو قیامت کے دن سوال ہوگا کہ تم نے کیا کیا تھا؟

سفید ریش بزرگ کی عمامہ پوشی:

کراچی میں ہمارے ایک قریبی تعلق والے تھے۔ وہ کہنے لگے: حضرت! میرا حفظ قرآن مجید مکمل ہو رہا ہے، آپ میری عمامہ پوشی کے لیے ضرور تشریف لائیں۔ میں

نے کہا: بہت اچھا۔ جب وہاں جانا ہوا تو میں نے ان کو دیکھا کہ ان کے سر کے بال بھی سفید، داڑھی کے بال بھی سفید، بھنوؤں اور پلکوں کے بال بھی سفید تھے۔ حتیٰ کہ پورے جسم پر کوئی سیاہ بال نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ کی عمر کتنی ہے؟ وہ کہنے لگے: جی! اس وقت میں تقریباً نوے سال کا ہو چکا ہوں۔

بھئی! اگر نوے سال کا بندہ آج کے دور میں قرآن پاک کا حفظ مکمل کر رہا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ میں اب ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں، ستر سال کا ہو گیا ہوں، اس لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کرنے والے آج کے دور میں بھی اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ بھئی! ہم بھی انہی میں سے ایک ہیں، ہمیں بھی چاہیے کہ ہم آج عہد کریں، ارادہ کریں کہ ہم اپنی دنیا کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی بھی پوری کوشش کریں گے۔ جب انسان ہمت سے کام لیتا ہے تو ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل حال ہو جاتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت دین میں بھی اور آگے بڑھائے اور اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

ایمان کی چار جہات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (النساء:۱۳۶)

سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (النساء: ۱۳۶)

"اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو اور اس کے رسول پر۔"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب فرمایا ہے اور ان کو بھی ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ اب یہ ظاہر میں عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یا تو یوں کہتے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا "اے کافرو! ایمان لے آؤ۔"

خطاب کیا تو ایمان والوں سے اور حکم دیا کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ مفسرین نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ تم کلمہ تو پڑھ چکے ہو، اب تم تقویٰ اختیار کرو۔ مگر علماء نے اس کا یہ نتیجہ نکالا کہ اے زبان سے اقرار کرنے والو! تم اپنے دل سے بھی اس کی تصدیق کردو۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ایمان کے دو حصے ہیں:

''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ''

''زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اس کی تصدیق کر دینا۔''

ان دو چیزوں سے ایمان مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان کے پاس دنیا میں جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، ان میں سے سب سے بڑی نعمت ایمان ہے۔ جان بھی اتنی بڑی نعمت نہیں، رزق بھی اتنی بڑی نعمت نہیں، عزت بھی اتنی بڑی نعمت نہیں، سب سے قیمتی اور سب سے بڑی نعمت بندے کے پاس ایمان والی نعمت ہے۔

ایمان کسے کہتے ہیں؟

نبی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ لے کر آئے، اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصدیق کر لینا، اس کو مان لینا، اس کو ایمان کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کا تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے، کیونکہ دل تسلیم کرتا ہے۔ ایمان حاصل کرنا بڑا آسان ہے، فقط دل کا معاملہ ہے، اس کے لیے کوئی دنیا کی ورزش تو نہیں کرنی پڑتی کہ اتنا دوڑے گا، بھاگے گا، وزن اُٹھائے گا، پھر مومن بنے گا۔ نہیں! کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، جس جگہ انسان بیٹھا ہے، اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے دل میں تصدیق کر دے اور زبان سے اس کا اقرار کر لے۔ پھر اس پر بہت بڑا انعام ملتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں فرمایا:

((اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ)) (صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۲)

''بے شک اسلام پہلے سب گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

جس بندے نے اسلام قبول کرلیا اس سے پہلے اس کے جتنے بھی گناہ ہوں گے، سب گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے! پہاڑوں کے برابر بھی اگر گناہ ہیں، گناہوں کا اتنا بوجھ ہے کہ پہاڑ پر رکھ دیں تو وہ بھی دبنے لگے، اللہ تعالیٰ ایمان لانے پر ان گناہوں کو بھی معاف فرما دیتے ہیں۔

ایمان کی چار جہات:

اس ایمان کے بارے میں آج کے زمانے میں خطرات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ بندے کے لیے ایمان بچانا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لیے میرے دل میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ ایمان کے متعلق چند باتیں کہی جائیں۔ اس لیے کہ جتنی قیمتی چیز ہو، اس کی حفاظت کے بارے میں اتنا ہی زیادہ تذکرہ ہونا چاہیے۔ ایمان کے بارے میں چار باتیں یاد رکھیں:

پہلی جہت

ایمان ملتا ہے طلب سے

سب سے پہلی بات ایمان کے بارے میں یہ یاد رکھیں کہ ایمان انسان کو طلب سے ملتا ہے۔ دنیا بغیر طلب کے مل سکتی ہے...... عزت بغیر طلب کے مل سکتی ہے...... مگر انسان کو ایمان بغیر طلب کے نہیں مل سکتا۔ دنیا میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔

ابو جہل اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی مثال:

ابو جہل کو دیکھیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چچا ہے، خونی رشتہ ہے، اگر شکل وصورت کو دیکھیں تو بہت خوبصورت تھا، عقل و دانائی کو دیکھیں تو ''ابو الحکم'' کہا جاتا تھا، یعنی داناؤں کا

باپ۔ صحت اچھی، دنیا میں اس کی عزت کا ڈنکا بجا ہوا تھا، لیکن اگر اس نے دل میں طلب نہیں رکھی تو اس کو دنیا میں ایمان نہیں ملا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ نعمت انسان کو طلب پر ملتی ہے۔ اس کے بالمقابل سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھیں! حبشہ سے تعلق رکھنے والے...... رنگ کے کالے...... ہونٹ موٹے...... شکل انوکھی...... مگر دل میں طلب تھی، اللہ رب العزت نے ان کو ایمان کی دولت عطا فرمائی۔ تو ایمان بندے کو ملتا ہے طلب سے۔

فرعون اور اس کے جادوگروں کی مثال:

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

﴿اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی﴾ (النازعات:۱۷)

''فرعون کے پاس چلے جاؤ، اس نے بہت سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔''

دیکھیں! نام لے کر فرمایا کہ آپ فرعون کے پاس جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس جاتے ہیں۔ اور فرعون کا حال دیکھیں کہ اس کے پاس کتنی بڑی بادشاہی تھی اور کتنا جابر بادشاہ تھا۔ وہ اپنی قوم کے اوپر اتنا غالب تھا کہ بنی اسرئیل کے ہزاروں بچوں کو اس نے ذبح کروایا، کوئی ایک آدمی بھی اس کے آگے بولنے والا نہیں تھا۔ ایسی Established (مستحکم) گورنمنٹ بھی تو کسی کی ہوتی ہوگی۔ آج کے زمانے میں اگر کسی ایک کا بچہ بھی ناجائز اس طرح مروا دے تو اس کی چھٹی ہو جائے گی، اور فرعون نے ہزاروں معصوم بچوں کو ذبح کروایا اور کوئی بولنے والا نہیں۔

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَنَادٰی فِرۡعَوۡنُ فِیۡ قَوۡمِهٖ قَالَ یٰقَوۡمِ﴾

''اور فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا کہ اے میری قوم!''

﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الزخرف:۵۱)

”کیا مصر کی سلطنت میرے قبضے میں نہیں ہے؟ اور (دیکھو!) یہ دریا میرے نیچے بہہ رہے ہیں۔کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟“

اپنی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کرنے لگا: میں نے کیسی یہاں پر Economic Reforms (اقتصادی اصلاحات) کی ہیں! کیسے تمہیں خوشحال بنا دیا ہے! اور پھر کہا:

﴿اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ﴾

(الزخرف:۵۲)

”یا پھر مانو کہ میں اس شخص سے کہیں بہتر ہوں جو بڑا حقیر قسم کا ہے، اور اپنی بات کھل کر کہنا بھی اس کے لیے مشکل ہے۔“

کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں زبان پر انگارہ رکھا تھا، اس لیے جب بولتے تھے تو زبان میں لکنت سی محسوس کرتے تھے۔اسی لیے تو فرمایا:

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ○ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ○﴾ (طٰہٰ:۲۵-۲۸)

اب دیکھیے کہ وہ ظاہر میں کتنا باکمال بندہ تھا، لیکن اگر اس کے اندر طلب نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی دولت سے نہیں نوازا۔اس کے بالمقابل جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے مقابلے کے لیے آئے اور مقابلہ شروع ہونا تھا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صرف ادب کی وجہ سے اتنا پوچھ لیا کہ جی!

﴿اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۱۵)

''(موسیٰ!) چاہو تو (جو پھینکنا چاہتے ہو) تم پھینکو، ورنہ ہم (اپنے جادو کی چیزیں) پھینکیں؟''

جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنی تھوڑی سی جو Respect (عزت) دی کہ یہ پوچھ لیا کہ آپ پہل کرتے ہیں یا ہم کریں؟ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو اتنی بھی جو عزت انہوں نے دی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو ایمان کو دولت عطا فرما دی۔ طلب نہیں تھی تو وقت کا بادشاہ محروم اور اگر تھوڑی سی بھی طلب تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس پوری جماعت کو ایمان عطا فرما دیا۔ اور پھر دیکھیے کہ بادشاہ نے کیا کہا؟ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ کو اور دوسرے طرف کے پاؤں کو کاٹوں گا۔ مقصد کیا تھا؟ کہ اگر ایک ہی طرف کا ہاتھ اور پاؤں کٹے تو آدمی پھر بھی دوسری طرف کے ہاتھ اور پاؤں سے چل پھر لیتا ہے، گزارا کر لیتا ہے، زندگی کے کچھ کام سمیٹ لیتا ہے، لیکن اگر بازو ایک طرف کا کٹا ہوا اور ٹانگ دوسری طرف کی کٹی ہو تو وہ بندہ اپنا بیلنس رکھ ہی نہیں سکتا، اس نے ایسی سزا تجویز کی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی حلاوت ایسی دے دی تھی کہ انہوں نے کہا:

﴿فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ﴾ (طٰہٰ:۷۲)

''اب تمہیں جو کچھ کرنا ہو، کرلو۔''

ہم ایمان سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ تو ایک اصول سامنے آیا کہ انسان کو ایمان ملتا ہے طلب سے۔ جب دل میں طلب ہوتی ہے تو ایمان نصیب ہوتا ہے اور جب انسان بے طلب بن جائے تو ایمان جیسی دولت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

بے طلبی پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چچا ایمان سے محروم:

ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اب اسلام کے

ٹھیکیدار بن گئے ہیں۔ طلب دل میں ہو تو پھر اللہ تعالیٰ یہ نعمت انسان کے دل میں باقی رکھتے ہیں۔ دیکھیے! ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے جو قریبی لوگ ہیں وہ نعمتوں سے نوازے جائیں۔ چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ آپ کے چچا آپ کے سامنے کلمہ پڑھ لیں اور آپ نے کہا بھی سہی کہ چچا ابو طالب! آپ اگر میرے کان میں کلمہ پڑھ لیں گے تو میں قیامت کے دن آپ کے ایمان کی گواہی دے دوں گا...... اب اللہ تعالیٰ کے محبوب کی کتنی چاہت ہوگی جو اپنے چچا سے یہاں تک فرما رہے ہیں! ان کے دل میں کتنی تمنا ہوگی کہ میرے چچا ایک مرتبہ یہ کلمہ کہہ دیں......! لیکن ان کے چچا نے نبی علیہ السلام کے سامنے کلمہ نہیں پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: اے پیارے!

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(القصص:۵۶)

''(اے پیغمبر!) حقیقت یہ ہے کہ جس کو تم خود چاہو، ہدایت تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔''

یہ ہدایت دینا تو اللہ کا کام ہے۔

بے طلبی پر نوح علیہ السلام کا بیٹا محروم:

اور دیکھیے! اولاد کے بارے میں بندے کی کتنی تڑپ ہوتی ہے کہ یہ اچھے بن جائیں، نیک بن جائیں اور یہ پریشانی سے بچ جائیں۔ تو اَن پڑھ جاہل قسم کا جو باپ ہوتا ہے اس کی بھی یہ نیک تمنائیں ہوتی ہیں۔ وقت کے نبی ہیں، بیٹا سامنے کھڑا ہے، تڑپ کر کہتے ہیں:

﴿يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا﴾ [ہود:۴۲]

''اے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ۔''

بیٹا سوار نہیں ہوتا۔ ایک لہر آتی ہے اور والد کی آنکھوں کے سامنے ان کا بیٹا پانی کے اندر ڈوب کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کتنا چاہتے ہوں گے کہ میرا بیٹا میری طرف آ جائے، مگر اس نوجوان کے دل میں طلب نہیں تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو محروم کر دیا۔

بے طلبی پر نوح علیہ السلام کی بیوی محروم:

بیوی کے بارے میں ہر بندے کی تمنا ہوتی ہے کہ جو خیر مجھے ملی ہے وہ میری بیوی کو بھی ملے، جو نعمت اللہ نے مجھے دی ہے وہ میری بیوی کو بھی ملے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، مگر ان کی بیوی ان کے ساتھ اختلافِ رائے رکھتی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جتنے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بیویاں دیں کہ جو با کردار تھیں، بدکار بیویاں نہیں دیں، مگر ایسا ہوا کہ ان میں سے چند ایک کو اختلافِ رائے ہو گیا، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی بیوی کو ہوا۔ اس کو بھی عجیب لگتا تھا کہ یہاں تو ہر طرف ریت ہی ریت ہے، اور یہ کہتے ہیں کہ سیلاب آئے گا۔ تو جیسے کفار مسخرہ پن کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم تو خود کہتے ہیں کہ ایسا پانی یہاں آنا چاہیے۔ بالکل ان کی بیوی کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی کہتی تھی کہ اس ریت میں کہاں سے پانی آئے گا؟ اس کو تو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔ اب ایک نبی کی بیوی ہیں، مگر اس کے دل میں طلب نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی دولت سے محروم فرما دیا۔

دل میں تڑپ ہو تو ایمان کی نعمت ملتی ہے:

ان مثالوں سے پتا چلتا ہے کہ ایمان بندے کو طلب کے ساتھ ملتا ہے۔ پاس رہنے والا ابولہب محروم رہتا ہے، ولید پلید محروم ہو جاتا ہے، اور دور سے آئے ہوئے صہیب

رومی رضی اللہ عنہ ایمان لے آتے ہیں۔ بلال رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے، ایمان لے آئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایران سے آئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ایمان کی توفیق عطا فرما دی۔ تو یہ اصول ذہن میں رکھ لیں کہ انسان کو ایمان طلب کے ذریعے ملتا ہے۔ جب دل میں تڑپ ہو، طلب ہو، تب یہ نعمت بندے کو ملتی ہے۔

تو ایمان کس چیز سے ملا......؟ طلب سے۔ اور ایک آدمی بے طلب بن جائے اور اسے ایمان کی پرواہی نہ ہو تو وہ محروم ہو جائے گا۔

دوسری جہت

ایمان چمکتا ہے مجاہدے سے

ایمان چمکتا ہے قربانی سے، مجاہدے سے۔

ایمان کا گھٹنا اور بڑھنا:

علماء نے ایمان کے بارے میں بڑی بحث کی ہے کہ

''اَلْاِیْمَانُ یَزِیْدُ وَ یَنْقُصُ''

''ایمان بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔''

جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''لَا یَزِیْدُ وَ لَا یَنْقُصُ''

''(ایمان) نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔''

سب نے اپنے دلائل دیے تو پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: آپ تو کہتے ہیں کہ ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں:

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾(الانفال:۲)

''اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں۔''

لہٰذا ایمان تو بڑھتا ہے۔ تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ایمان کی مقدار تو وہی رہتی ہے، لیکن اس کی چمک دمک بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ چنانچہ گناہ کرے گا تو اس کی چمک گھٹ جائے گی اور نیک اعمال کرے گا تو اس کی چمک بڑھتی جائے گی، مقدار وہی ہوتی ہے۔

اعمالِ صالحہ سے ایمان کی پاور بڑھتی ہے:

تو جتنا انسان نیک اعمال کرے گا، اتنا ہی ایمان چمکتا چلا جائے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ بلب تو ایک ہی ہے، لیکن یا وہ سو واٹ کا ہے یا دو سو واٹ کا ہے یا پانچ سو واٹ کا ہے۔ بلب ایک ہی ہے، لیکن اس کی پاور بڑھتی رہتی ہے یا گھٹتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان کا ایمان تو ایک ہی ہے، لیکن نیک اعمال کی وجہ سے اس کی پاور بڑھتی چلی جاتی ہے اور گناہوں کی وجہ سے اس کی پاور گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اگر انسان چاہے کہ اس کا ایمان چمک جائے اور زیادہ حلاوت نصیب ہو جائے تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ مجاہدہ کرے۔ جتنا مجاہدہ ہوگا اتنا ہی زیادہ ایمان چمکے گا۔

اب یہ مجاہدہ کسی طرح سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

- ...... نفس کی خواہشات کو اللہ کے لیے ترک کر دینا، یہ بھی ایک مجاہدہ ہے۔
- ...... یا ایمان کے بنانے کے لیے محنت کرنا، یہ بھی مجاہدہ ہے۔
- ...... یا ایمان کی خاطر اپنا مال قربان کر دینا، یہ بھی مجاہدہ ہے۔

تو کوئی بھی قربانی ایمان کی خاطر کی جائے اس سے انسان کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کا ایمان مضبوط سے اضبط ہوجاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایمان کی خاطر قربانیاں:

اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔ ان پر کیسے کیسے مجاہدے آئے؟ نبی علیہ السلام نے ان کو بتادیا:

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ گو کہ تمہیں ٹکرے ٹکڑے کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے۔'' [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۰۳۴]

چنانچہ بعض ایسے حضرات بھی تھے جن کو دنیا کے سبز باغ دکھائے گئے، لالچ دیا گیا، لیکن وہ ایمان پر ثابت قدم رہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ثابت قدمی:

جیسے ایک صحابی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ایک جہاد میں نہ جا سکے تو نبی علیہ السلام نے کچھ عرصہ کے لیے ان سے سول بائیکاٹ کا حکم فرمایا۔ اس حالت میں غسان کے بادشاہ کو پتا چلا تو اس نے اپنا بندہ بھیج کر پیغام بھجوایا کہ سنا ہے تمہارے ساتھ سب لوگوں نے قطع تعلق کیا ہوا ہے، تم میرے پاس آجاؤ تو میں تمہیں بہت زیادہ نوازوں گا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے وہ خط جب پڑھا تو میں نے اسے ایک آزمائش سمجھتے ہوئے تنور کے اندر جلا دیا۔

(صحیح بخاری، حدیث: ۴۴۱۸ باب حدیث کعب بن مالک رضی اللہ عنہ الخ)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا رومی بادشاہ کو جواب:

اسی طرح کا واقعہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا معاملہ آپس میں رنجش کا چل رہا تھا، تو رومی بادشاہ نے ان کو بھی اسی طرح پیغام بھیجا کہ آپ ہمیں بتائیں، ہم آپ کی مدد کریں گے اور آپ کو حق لے کر دیں گے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے جواب دیا:

''او رومی کتے! اگر تو نے یہ سوچا تو یاد رکھنا! میں علی کی فوج کا پہلا سپاہی ہوں گا جو تیرے خلاف لڑنے کے لیے تیرے سامنے آؤں گا۔''

تو ایمان کے معاملے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیاں بڑی عجیب ہیں۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی ایمان پر ثابت قدمی:

ایک واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو کفار نے گرفتار کرلیا۔ کفار کے بادشاہ نے بہت کوشش کی کہ یہ اپنے دین سے پھر جائے اور ہمارا دین اختیار کرلے، لیکن وہ اس بات کو قبول نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو بادشاہ نے تنگ آ کر گھر میں یہ بات کردی کہ بھئی! یہ بندہ کیا ہے کہ بات مانتا ہی نہیں؟ تو اس کی جوان العمر بیٹی جو شکل میں حور پری تھی، وہ کہنے لگی: ابو! مجھے آپ موقع دیں، میں دیکھتی ہوں کہ یہ کیسے ہمارے دین کی طرف مائل نہیں ہوتا؟ تو والد نے اس کو اجازت دے دی۔ جس جگہ پر وہ قید تھے، چالیس دن اس جگہ پر وہ لڑکی بن سنور کر ان کے پاس جاتی رہی، کبھی کھانا پہنچانے اور کبھی کام کرنے کے بہانے۔ چالیس دن اس اللہ کے بندے نے اس کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ لڑکی خود حیران ہوئی کہ یہ کیسا مرد ہے! میری شکل دیکھنے کو تو لوگ ترستے اور تڑپتے ہیں اور میں بن سنور کر آتی ہوں اور یہ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔

چالیس دن کے بعد بالآخر اس نے پوچھ لیا کہ جی! آپ نے کیوں مجھے دیکھا تک نہیں؟ تو انہوں نے بتایا: میرے اللہ کا حکم ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (النور: ۳۰)

''ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ نظریں نیچی رکھیں۔''

اس لیے میں تو اپنی آنکھیں نیچی رکھوں گا۔تو اب اس لڑکی کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ اس بندے کے اندر کیا نعمت ہے کہ اس نے اس میں اتنی استقامت پیدا فرمادی؟ تو وہ پوچھنے لگی: کیا یہ چیز میرے اندر آسکتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! چنانچہ انہوں نے اس کو کلمہ پڑھا دیا۔اب یہ لڑکی جاتی تھی تو یہ اس کو دین سکھاتے تھے۔اب یہ ظاہر میں کہتی رہی: ابو! میں کوشش کر رہی ہوں، چند دنوں میں سیدھا ہو جائے گا، یہ کہتے کہتے خود سیدھی ہو گئی۔اس کو کہتے ہیں: ''شکار کرنے کو آئے، شکار ہو کر چلے''۔آئی تھی ان کو متوجہ کرنے کے لیے اور اللہ نے اس کو متوجہ کر دیا۔حتیٰ کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ انہوں نے مل کر ایک پروگرام بنایا۔لڑکی نے کہا: ابو! اس کو قید ہوئے بہت عرصہ ہو گیا، اس کو تھوڑا باہر کی فضا میں بھی لے جانا چاہیے، اس کے لیے کوئی شکار کا بندوبست کریں، سواری کا بندوبست کریں، میں اس کے ساتھ جنگل میں جانا چاہتی ہوں۔باپ نے سواری کا انتظام کر دیا، دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور اللہ نے ان کو اپنی منزل تک پہنچا دیا۔

تو ایسا بھی ہوا کہ چالیس چالیس دن تک ایک خوبصورت عورت کوشش کرتی ہے اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے، یہ قربانی ہے۔وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہماری وہ نعمت ہے کہ جس کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا۔دنیا کی کوئی چیز ایمان کا بدل نہیں ہو سکتی، وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔تو ایمان ملتا ہے طلب سے اور چمکتا ہے مجاہدے سے، جتنا مجاہدہ ہو گا

اتنا چمکے گا، اتنا مضبوط سے اضبط ہوگا۔

تیسری جہت

ایمان پھیلتا ہے ہجرت سے

اور ایمان پھیلتا ہے ہجرت سے۔ جتنا امت میں ہجرت رہے گی اتنا ہی ایمان پھیلے گا۔ آپ دیکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب تک مکہ مکرمہ میں رہے تو بس ایک گھر کے اندر تعلیم دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بعد باہر نکل کر سر عام آنے لگے، تب بھی مرکز ''دارارقم'' ہی تھا۔ وہاں سے ہجرت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کو پھر کھولا اور مشرق سے مغرب تک اس پیغام کو پہنچادیا۔

آج بھی ہم دنیا میں دیکھیں تو کفر پھیلانے والی طاقتیں اربوں کھربوں کے بجٹ کے ساتھ پوری دنیا میں ارتداد اور کفر پھیلانے کی کوششیں کر رہی ہیں اور اس کے مقابلے میں ایمان والوں کی کوششیں کتنی تھوڑی سی ہیں، مگر وہ تھوڑی سی کوششیں بھی کفر کے سامنے ایک بند بن گئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایمان کی دولت سے نوازا ہوا ہے۔

کفر مردہ اور اسلام ایک زندہ مذہب ہے:

آپ حیران ہوں گے کہ پوری دنیا میں کفر پھیلانے کے لیے کفر مال پیسے کے ذریعے اتنا منظم کام کر رہا ہے کہ کوئی حد نہیں، مگر فرق یہی ہے کہ جب کوئی مردہ ہوتو وہ خود نہیں چلا کرتا، بلکہ اس کو کسی کے کندھے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاش چونکہ مردہ ہے، لہٰذا اس کو چلنے کے لیے کندھے کی ضرورت ہے۔ تو کفر کی حالت اسی مردے کی طرح

ہے، اب اس کو پیسے کے کندھے کی ضرورت ہے۔ اور جو زندہ انسان ہے اس کو کسی کے کندھے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنی ٹانگوں پر چل کر جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام ایک زندہ مذہب ہے، زندہ دین ہے۔

دینِ اسلام ہمارا محتاج نہیں، ہم اس کے محتاج ہیں:

دینِ اسلام کو ہمارے کندھے کی بھی ضرورت نہیں ہے، یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ اللہ ہمیں اسلام کی خدمت کی توفیق عطا فرما دیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا﴾

''یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں۔''

﴿قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ﴾

''ان سے کہو کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ۔''

﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (الحجرات: ۱۷)

''بلکہ تم اگر واقعی (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔''

تو دینِ اسلام کسی کا محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اس کے محتاج ہیں۔

چوتھی جہت

ایمان محفوظ رہتا ہے حقوق العباد کی ادائیگی سے

ایمان محفوظ رہتا ہے حقوق العباد کی ادائیگی سے۔ جو بندہ اکثر و بیشتر حقوق العباد میں

کوتاہی کرنے والا ہوگا، اس کا ایمان خطرے میں رہے گا۔ اب اس کی دلیلیں سن لیجیے!

ملاوٹ کرنے والے کا ایمان خطرے میں:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا)) (ترمذی، حدیث: ۱۳۱۵)

''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

''ہم میں سے نہیں ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایمان پر موت نہیں آئے گی۔ دراصل ملاوٹ کرنے سے اللہ کے بندوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ ہم بے ایمانی کر رہے ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کے ساتھ ہم دھوکا کر رہے ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کا حق مار رہے ہوتے ہیں۔ تو اب دیکھیے کہ حقوق العباد میں ایک ایسی کوتاہی کی کہ جس پر اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو ایسی موت آئے گی کہ یہ اسلام سے ہی خارج کر دیا جائے گا۔

چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کا اکرام نہ کرنے والے کا ایمان خطرے میں:

ایک جگہ فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا))

(ترمذی، حدیث: ۱۹۱۹)

''جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا اکرام نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

اب اس کا تعلق کس چیز سے ہے......؟ حقوق العباد سے ہے۔ چھوٹوں پر رحم کرنا اور بڑوں کا ادب واحترام کرنا، یہ حقوق العباد ہیں۔ جو حقوق العباد میں کوتاہی کرے گا

وہ مرتے وقت ایمان سے محروم کر دیا جائے گا۔

اللہ کا مقرب بننے کے لیے حقوق العباد کا اہتمام ضروری ہے:

اس لیے اگر بندہ چاہتا ہے کہ موت کے وقت اس کا ایمان سلامت رہے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کا بھی حق ادا کرے اور اللہ کے بندوں کا بھی حق ادا کرے۔ اب یہاں کئی دفعہ ہم غلطی کر جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم مصلّے پر باقاعدگی سے بیٹھتے ہیں اور ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر ذکر کرتے ہیں اور ہم دین کی بات کرتے ہیں تو بس ہم بڑے پہنچے ہوئے ہیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ

......ہم اپنی اولاد کو Ignore (نظر انداز) کر رہے ہوتے ہیں، ان کا حق نہیں ادا کر رہے ہوتے۔

......اپنے اہل خانہ کو Ignore (نظر انداز) کر رہے ہوتے ہیں۔

......اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچا رہے ہوتے ہیں۔

......ہم اللہ کے بندوں کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

تو پھر ایسی صورت میں ایمان کیسے محفوظ رہے گا؟ اس لیے حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

ہمارے حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

......اللہ تعالیٰ کو خوش کرو عبادت سے۔

......نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خوش کرو اطاعت سے۔

......اور مخلوقِ خدا کو خوش کرو خدمت سے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا مقرب بنالیں گے۔

دورِ حاضر میں جذبہ خدمت کی کمی:

پہلے وقتوں میں ہر بندے نے کوئی نہ کوئی خدمت کا کام اپنے ذمے لیا ہوتا تھا۔ مثلاً: کسی نے ذمہ لیا ہوتا تھا کہ میں اس نابینا کی خدمت کروں گا...... میں اس بوڑھی بیوہ کی خدمت کروں گا...... میں اس غریب کی خدمت کروں گا......کوئی نہ کوئی خدمت کا کام اپنے ذمے لیا ہوتا تھا۔ آج وہ جذبہ دل سے نکلتا چلا جارہا ہے۔ ایسی نفسانفسی کا عالم ہے کہ ''اَلْاَمَانُ وَالْحَفِیْظُ'' کتابوں میں تو لکھا ہے کہ قیامت کے دن نفسانفسی کا عالم ہوگا اور اہلِ باطن، جن کو اللہ نے نظر دی ہے، وہ آج کے دور میں بھی نفسانفسی کو خود دیکھ رہے ہیں۔ ہر بندے کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ دنیا کے پیچھے ہم ایسے دیوانے ہو کر بھاگے پھر رہے ہیں کہ ہمیں کسی کی سمجھ ہی نہیں لگتی۔ ہم خدمت کے ذریعے سے اپنے اللہ کو راضی کر لیں، یہ جذبہ ہی نہیں ہے، بلکہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ اگر کسی کی جیب میں کچھ پیسے نظر آجائیں تو ہم ان کو بھی کسی طرح سے نکال لیں۔ اس لیے جو ہمارے جتنا زیادہ قریب ہے وہ اتنا ہی ہم سے زیادہ پریشان ہے۔ اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معاملہ کیا تھا؟ کہ جو جتنا زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب تھا، وہ اتنا ہی زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے والا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنے والا تھا۔

پڑوسی کی خدمت اللہ تعالیٰ کی خدمت ہے:

خدمت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنا، یہ جذبہ ہمارے اندر ہونا چاہیے۔ دیکھیں بھئی! حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے کو بلائیں گے اور اس سے فرمائیں گے:

......میرے بندے! میں بیمار تھا، تو نے میری عیادت نہیں کی۔

......میرے بندے! میں بھوکا تھا، تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔

......میرے بندے! میں پیاسا تھا، تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔

تو وہ بندہ بڑا حیران ہو کر کہے گا: اے اللہ! آپ تو کھانے، پینے اور بیمار ہونے سے بلند و بالا ہیں، آپ کی ذات میں تو ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ فلاں موقع پر میرا فلاں بندہ بیمار تھا......

......اگر تو اس کی عیادت کے لیے جاتا تو ایسے ہی ہوتا جیسے تُو نے میری عیادت کی۔

اور فلاں موقع پر میرا فلاں بندہ بھوکا تھا......

......اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو ایسا ہی ہوتا جیسے تُو نے مجھے کھانا کھلایا ہے۔

اور فلاں موقع پر میرا فلاں بندہ پیاسا تھا......

......اگر تو اسے پانی پلاتا تو ایسا ہی ہوتا جیسے تُو نے مجھے پانی پلایا ہے۔

(صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۶۹ باب فضل عیادۃ المریض)

اب بتائیے! یہ کتنی بڑی بات ہے!

بوڑھے کا اکرام......اللہ کا اکرام:

حدیث پاک میں آتا ہے:

((اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰهِ اِكْرَامَ ذِی الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ))

(ابوداؤد، حدیث: ۴۸۴۳ باب فی تنزیل الناس منازلھم)

"بے شک اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں سے ہے کہ بوڑھے مسلمان کا اکرام کیا جائے۔"

جس بندے نے ایمان کی حالت میں اپنے بالوں کو سفید کر لیا ہو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی عزت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے اللہ رب العزت کا اکرام کیا ہو۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مخلوقِ خدا کو خدمت کے ذریعے سے ہم خوش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائیں گے۔

سو میں سے دس مرنے والوں کو کلمہ نصیب ہوا!!!

ایک ڈاکٹر نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اس نے سو بندوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھا۔ چونکہ ڈاکٹر لوگ تو روزانہ ایمرجنسی میں ڈیل کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے سامنے مریض آتے ہیں تو کئی دفعہ ایسے وقت میں آتے ہیں کہ بالکل آخری لمحات میں ہوتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں: میں نے سو بندوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تو ان میں سے کتنے ہی لوگ ایسے تھے کہ ان کو میں نے تلقین کی کہ کلمہ پڑھ لو! کلمہ پڑھ لو! یا ان کے سامنے میں نے کلمہ پڑھا۔ کہتا ہے کہ مشکل سے ان میں سے دس یا پندرہ بندوں نے کلمہ پڑھا ہوگا، باقی کو میں نے کلمہ پڑھتے نہیں دیکھا، میرے حساب سے وہ بغیر کلمہ پڑھے دنیا سے چلے گئے۔

یہ مسلمانوں کے ماحول کا واقعہ ہے۔ یہ کفر کی دنیا کے مسلمانوں کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ ایسے ملک کا ہے جہاں چاروں طرف مسلمان ہیں۔ تو وہ کہتا ہے: میں اس بات پر بہت پریشان ہوا، اور پھر میں نے بعض مریضوں کو کاغذ پر لکھ کر دکھایا کہ کیا آپ کلمہ پڑھنا چاہتے ہیں؟ آپ کی زبان ساتھ نہیں دے رہی؟ تو جب میں نے ایسے مریضوں کو وہ لکھا ہوا دکھایا تو انہوں نے اشارے سے ہمیں بتایا کہ جو تم پڑھ رہے ہو ہم بھی وہ پڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ہماری زبان پر اس وقت ہمارا کنٹرول نہیں رہا۔ وہ کہتا ہے: اصل میں جب انسان کے اعمال میں کمزوری ہوتی ہے، تو موت کے وقت جیسے فالج زدہ انسان چاہتا ہے کہ ہاتھ ہلائے، لیکن ہلا نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر فالج

ڈال دیتے ہیں، چاہے بھی سہی کہ کلمہ پڑھ لے، مگر آخری وقت میں اللہ تعالیٰ کلمہ پڑھنے کی توفیق عطا نہیں فرماتے۔

تو بھئی! اس سے پہلے کہ زبان پر کنٹرول ختم ہو جائے، ہمیں چاہیے کہ اس زبان سے خوب کلمے کا ذکر کر لیں، خوب اپنے رب کو یاد کر لیں۔

دل میں ٹیں ٹیں ہو تو زباں پر بھی ٹیں ٹیں ہو گا:

ایک صاحب نے طوطا پالا ہوا تھا اور اس کو ''اللہ اللہ'' کا لفظ سکھایا ہوا تھا۔ اب طوطا جب ''اللہ...... اللہ...... اللہ'' کا لفظ کہتا تو لوگ اس پر بڑے خوش ہوتے، حیران ہوتے اور دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ طوطا جس پنجرے میں تھا، ایک دن وہ اس پنجرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ تو بلی صاحبہ بھی کہیں سے آ پہنچیں۔ اس نے جب اس طوطے کی گردن پکڑی اور اس کو لے کر بھاگی تو طوطے نے ''ٹیں ٹیں'' کی، اس وقت اس کو پتا چلا کہ میرا طوطا تو میرے ہاتھ سے گیا۔ اب اس بندے کو دو رنج تھے، ایک رنج تو اس بات کا کہ میرا نقصان ہو گیا اور ایک رنج اس بات کا کہ میں نے اتنی محنت سے یہ لفظ سکھایا تھا، اب اگر میں اور طوطا خرید بھی لوں تو مجھے اس کو سکھانے کے لیے اتنی محنت پھر کرنی پڑے گی، تو یہ بہت زیادہ غم زدہ تھا۔

پھر یہ کسی بزرگ سے ملا اور اسے اپنا واقعہ سنایا۔ واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگا: جی! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ میں نے اپنے طوطے کو ''اللہ اللہ'' کا لفظ سکھایا تھا اور وہ ''اللہ اللہ'' پڑھا کرتا تھا، لیکن جب بلی اس کو لے کر بھاگی تو اس وقت تو وہ ''ٹیں ٹیں'' کر رہا تھا، ''اللہ اللہ'' کیوں نہیں کہہ رہا تھا؟ ان بزرگوں نے اس وقت اس کو بات سمجھائی کہ دیکھو! جب انسان پر موت کی مصیبت آتی ہے تو انسان کی زبان سے وہ

نکلتا ہے جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے۔ طوطے کی زبان پر ''اللہ اللہ'' تھا، مگر اس کے دل میں ''ٹیں ٹیں'' تھی اور جب بلی نے گردن دبوچی تو وہ نکلا جو دل میں تھا۔ تو بھئی! اگر ہمارے دل کے اندر دنیا کی ''ٹیں ٹیں'' ہی پڑی ہوئی ہو اور زبان سے ہم جو مرضی نعرے لگاتے پھریں تو موت کے وقت کیا نکلے گا؟

کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ تھے اور وہ اکثر و بیشتر ہاتھوں کی انگلیوں پر ذکر کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی آپریشن کے سلسلہ میں ان کو بے ہوش کر دیا گیا تو بے ہوشی کی حالت میں بھی ان کی انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔

میں نے ایک مرتبہ یہ واقعہ کسی کو سنایا تو اس نے اپنے والد کا واقعہ سنایا۔ کہنے لگا: میرے والد کے ساتھ بھی بالکل یہی واقعہ پیش آیا کہ وہ اکثر تسبیح پڑھتے رہتے تھے۔ کہنے لگے: ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرے والد کو ہسپتال میں بے ہوش کیا گیا اور ان کے ہاتھ اور انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں جیسے تسبیح پڑھ رہے ہوں۔ تو ڈاکٹر نے ہمیں یہی بتایا کہ چونکہ اس کا دماغ سگنل دیتے دیتے اتنا عادی بن چکا ہے کہ جب بے ہوش ہو گیا تو پھر بھی سگنل مل رہا ہے اور ہاتھ ہل رہے ہیں۔

یہاں پر پتا چلتا ہے کہ جو حضرات ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ذکر روزانہ ہزاروں دفعہ کرتے ہیں تو کرتے کرتے پھر ایک دن وہ کیفیت آجاتی ہے کہ جب ایسے بندے کو موت کے حالات میں سے بھی گزرنا پڑے تو اللہ تعالیٰ زبان پر کلمے کو جاری فرما دیتے ہیں۔

روزِ قیامت اللہ کی رحمت کا معاملہ:

بھئی! اگر ایمان بچ گیا تو جنت میں داخلہ ایک نہ ایک دن ہو ہی جائے گا، یہ پکی بات ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ (الاحزاب: ۴۳)

''اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔''

''خطباتِ حکیم الاسلام'' میں مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی عجیب بات فرماتے ہیں! کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اتنا ظہور ہوگا، اتنا ظہور ہوگا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ شیطان بھی سر اُٹھا کر دیکھے گا اور اس کو بھی اُمید لگ جائے گی کہ شاید آج مجھے بھی بخش دیا جائے گا۔ پھر انہوں نے ایک دو عجیب و غریب واقعات بھی بیان فرمائے ہیں کہ اللہ کی رحمت کیسے بہانے ڈھونڈے گی؟

روزِ قیامت دو بندوں پر اللہ کی رحمت:

ایک واقعہ جس کو میں اپنے علماء سے بعض اوقات سنتا تو تھا، لیکن میں نقل نہیں کیا کرتا تھا، لیکن جب سے میں نے ''خطباتِ حکیم الاسلام'' میں یہ واقعہ پڑھا تو اب میں نقل بھی کر دیا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک بندے کو بلائیں گے اور کہیں گے کہ اے میرے بندے! تو نے زندگی اچھی نہیں گزاری۔ اس کا حساب کتاب ہوگا تو بہت زیادہ گناہ ہوں گے اور تھوڑی سی نیکیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: چلو جہنم میں۔ وہ جہنم کی طرف بھاگنا شروع کر دے گا۔

پھر دوسرے کو بلا کر حساب کتاب لیں گے اور فرمائیں گے: تم نے اچھی زندگی نہیں گزاری، جاؤ جہنم میں۔ وہ تو جہنم کی طرف جانا شروع کر دے گا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھتا جائے گا۔ چلتا بھی جائے گا اور تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی جائے گا، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو بلا لیں گے۔ بلا کر پہلے سے پوچھیں گے: بھئی! بتاؤ

تمہیں جب کہا کہ جاؤ جہنم میں، توتم نے تو دوڑ ہی لگادی۔ وہ بندہ جواب دے گا: یا اللہ! دنیامیں توحکم ماننے میں کوتاہی کرتا ہی رہا، اب جب آپ کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا تو میں نے سوچا کہ چلو اس پر ہی میں ٹھیک طرح سے عمل کرلوں، اس لیے میں تیزی سے جہنم کی طرف بھاگ پڑا۔ اللہ تعالیٰ دوسرے کو پوچھیں گے کہ تمہیں بھی توحکم دیا تھا کہ جاؤ جہنم میں، اورتم تو آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور پیچھے مڑمڑ کر بھی دیکھتے جاتے تھے۔ وہ کہے گا: یااللہ! دنیامیں جب بھی میرے ساتھ کوئی معاملہ ہواتو ہمیشہ آپ نے رحمت کا معاملہ کیا، اے اللہ! حکم ہوگیا کہ جہنم میں جاؤ، میں دو چار قدم آگے چل کر پیچھے دیکھتا تھا کہ شاید آپ کی رحمت اب بھی متوجہ ہوجائے، اب بھی متوجہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے کوفرمائیں گے کہ ہم نے تجھے بھی جنت عطا فرمادی اور دوسرے کوکہیں گے کہ جب تجھے ہم سے اب بھی رحمت کی اُمید ہے تو تجھے بھی ہم نے جنت عطا فرمادی۔

جب کسی افسر نے کوئی کام کسی کی Favour (حمایت) میں کرنا ہوتا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی Logic (دلیل) نکال لیتا ہے، بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسی طرح اللہ رب العزت قیامت کے دن جب ارادہ فرمالیں گے کہ ایمان والوں کو میں نے نکالنا ہے تو پھر اس کے لیے بہانے بھی ڈھونڈ لیں گے۔ کیسے کیسے بہانے ہوں گے؟

باپ بیٹا جنت میں:

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کی میزانِ عمل کے دونوں پلڑے برابر ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: تم جنت والوں میں سے نہیں ہو، اور نہ ہی دوزخ والوں میں سے ہو۔ تو اس وقت ایک فرشتہ ایک کاغذ لے کر آئے گا اور اس کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے گا۔ اس کاغذ میں ''اُف'' لکھی ہوگی۔ یہ ٹکڑا

نیکیوں پر بھاری ہو جائے گا، کیونکہ یہ (والدین کی) نافرمانی کا ایسا کلمہ ہے جو دنیا کے پہاڑوں سے بھی زیادہ وزنی ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کو دوزخ میں لے جانے کا حکم ہوگا۔ کہتے ہیں کہ وہ شخص مطالبہ کرے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس واپس لے چلیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کو واپس لوٹاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے: اے نافرمان بندے! کس وجہ سے تم میرے پاس واپس آنے کا مطالبہ کر رہے تھے؟ وہ عرض کرے گا: الٰہی! آپ نے تو دیکھ لیا کہ میں دوزخ کی طرف جا رہا ہوں اور اس سے مجھے کوئی جائے فرار نہیں، میں اپنے والد کا نافرمان تھا، حالانکہ وہ بھی میری طرح دوزخ میں جا رہا ہے۔ آپ میرے عذاب کو بڑھا دیں اور اس کی وجہ سے میرے والد کو دوزخ سے نجات دے دیں۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے اور فرمائیں گے: تو نے دنیا میں تو اس کی نافرمانی کی اور آخرت میں اس کے ساتھ نیک سلوک کیا، اپنے باپ کا ہاتھ پکڑو اور دونوں جنت میں چلے جاؤ۔

(التذکرۃ للقرطبی، بحوالہ جنت کے حسین مناظر: ص ۱۵۳)

ایک نیکی پر جنت:

کتابوں میں ایک واقعہ اور لکھا ہے کہ روزِ قیامت ایک شخص کو پیش کیا جائے گا۔ اس کو اپنے لیے کوئی ایسی نیکی نہیں ملے گی جس سے اس کی ترازو بھاری ہو سکے۔ چنانچہ اس کی ترازو برابر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو فرمائیں گے: لوگوں کے پاس جاؤ اور اس شخص کو ڈھونڈو جو تمہیں ایک نیکی دے دے اور میں تجھے اس کے بدلے میں جنت میں داخل کر دوں۔ چنانچہ وہ تمام مخلوقات کے درمیان گھومے گا اور کسی ایک شخص کو بھی ایسا نہ پائے گا، جو اس سے اس معاملے میں گفتگو کرے۔ بس وہ یہی

کہے گا: مجھے ڈر ہے کہ میرا اعمال نامہ ہلکا نہ ہو جائے، اس لیے میں اس نیکی کا آپ سے زیادہ محتاج ہوں، تو وہ مایوس ہو جائے گا۔ تب اس کو ایک شخص کہے گا: تُو کیا ڈھونڈتا ہے؟ تو وہ کہے گا: صرف ایک نیکی، حالانکہ میں ایسی قوم کے پاس سے بھی گزرا ہوں کہ ان کے پاس ہزار (ہزار) نیکیاں تھیں، لیکن انہوں نے مجھے دینے سے بخل کیا۔ تو اس کو وہ شخص کہے گا: میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر تھا اور میں نے اپنے اعمال نامے میں صرف ایک نیکی پائی تھی، میرا یقین ہے کہ وہ میری ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔ اس کو تم بطور ہبہ کے لے جاؤ، تو وہ اس نیکی کو لے کر خوشی اور سرور کے ساتھ چل پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: تیرا کیا حال ہے؟...... حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے حال کو خوب جانتے ہوں گے...... وہ عرض کرے گا: اے پروردگار! میرے ساتھ ایسا اتفاق ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے اس ساتھی کو بلائیں گے جس نے اس کو نیکی ہبہ کی تھی اور اس سے فرمائیں گے: میرا کرم تیرے کرم سے وسیع ہے، اپنے اس بھائی کا ہاتھ پکڑو اور دونوں جنت میں چلے جاؤ۔ (التذکرۃ، بحوالہ جنت کے حسین مناظر: ص ۱۵۲)

ایمان کے لیے متفکر رہنے کی ضرورت:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایمان والوں کو جنت میں بھیجنے کے بارے میں کتنا رحمت کا معاملہ فرمائیں گے......! تو ایمان اگر دنیا سے محفوظ چلا گیا تو میرے دوستو! ایک نہ ایک دن اللہ کی رضا والی جگہ جنت میں جانا نصیب ہو جائے گا۔ اس لیے ایمان کی حفاظت کے بارے میں بہت متفکر رہنا چاہیے، بہت متفکر رہنا چاہیے۔ اللہ رب العزت ہمارے ایمان کو سلامت رکھے اور دنیا کے فتنوں سے ہمیں بچائے۔ (آمین)

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: قربِ قیامت کے فتنوں میں سے ایک یہ ہے کہ صبح ایک آدمی اُٹھے گا تو ایمان والا ہوگا، لیکن شام کے وقت وہ ایمان سے خالی ہوگا۔ (مسند احمد، حدیث: ۱۸۴۰۴)

ہم آج اس دور میں زندگی گزار رہے ہیں کہ جس دور میں پیدا ہونے سے ہمارے اسلاف نے اپنے تقویٰ وطہارت والی زندگی ہونے کے باوجود اللہ کی پناہ مانگی تھی۔ آج ہم اپنی بے علمی اور بے احتیاطیوں کے باوجود اس دور میں زندہ ہیں۔ اب سوچنے کی بات ہے کہ ہمیں کتنی احتیاط کرنے کی ضرورت ہے......! کتنا فکر مند ہونے کی ضرورت ہے......! اللہ رب العزت ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے، ہمیں اس کو چمکانے کی توفیق عطا فرمائے اور موت کے وقت اس ایمان کی حفاظت کے ساتھ دنیا سے جانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایمان اللہ کی حفاظت میں دے دیجیے:

کہتے ہیں کہ کوئی بچہ جب کسی چھوٹے بچے کی حفاظت نہیں کر سکتا تو اس کو اپنے بڑوں کے پاس محفوظ کروالیتا ہے۔ تو آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ بھی یونہی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ اے اللہ! میں اس (ایمان) کی حفاظت نہیں کر پاؤں گا، میں اسے آپ کی حفاظت میں دیتا ہوں، جب میرا دنیا سے جانے کا وقت ہو، اللہ! مجھے ایمان کی حفاظت کے ساتھ دنیا سے جانے دینا اور کلمہ کی توفیق عطا فرما دینا۔ جب اس طرح ہم فکرمند ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا معاملہ ہوگا۔

ایمان والے کی اللہ کے ہاں اہمیت:

ایک ایمان والے کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی اہمیت ہے کہ جب تک وہ زندہ ہوگا،

اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی۔فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ: ''اَللّٰهُ اَللّٰهُ''))

(صحیح مسلم، حدیث:۱۴۸ باب ذہاب الایمان آخر الزمان)

''جب تک دنیا میں ''اللہ اللہ'' ہوتی رہے گی، قیامت قائم نہیں ہوگی۔''

اس سے ایمان کی اہمیت کا اندازہ لگالینا چاہیے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس قیمتی متاع کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں قیامت کے دن ایمان والوں کے زمرے میں کھڑا فرمائیں اور اپنی پسندیدہ جگہ جنت عطا فرمادیں۔(آمین ثم آمین)

﴿وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾